www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

March 2007 ● No. 364

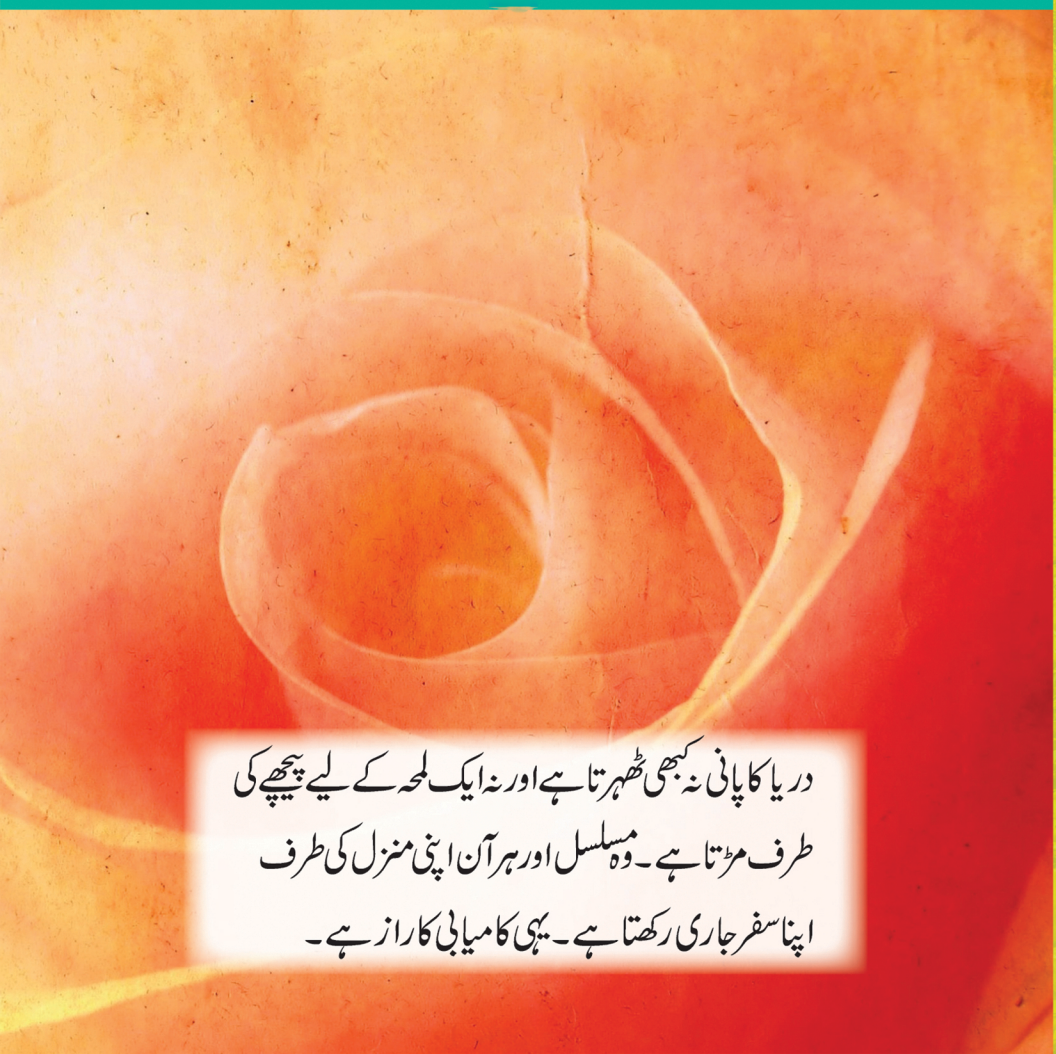

دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ
الرسالہ
Al-Risāla

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

مارچ 2007

فہرست

منفی سوچ کا انجام	2
زمانی بصیرت رکھنے والے علماء کی ضرورت	3
تفریق کیا ہے	17
موت کا مثبت تصور	27
محاسبہ یا ڈی کنڈیشننگ	30
تزکیہ نام ہے تربیتِ شعور کا	34
امید پر خاتمہ	36
عورت معاونِ حیات	39
الرسالہ مشن کے متعلق بعض سوالات	42

منفی سوچ کا انجام

عراق کے صدر صدام حسین نے تقریباً 30 سال تک عراق کے اوپر ڈکٹیٹرانہ حکومت کی۔ انھوں نے اپنے دعوے کے مطابق، مغربی قوموں کے خلاف سب سے بڑی جنگ چھیڑی، جس کو وہ ''اُمُّ المعارک'' کہتے تھے۔ امریکا سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ ان کا آخری انجام یہ ہوا کہ 30 دسمبر 2006 کو انھیں عراق میں پھانسی دے دی گئی۔ یہ پورا واقعہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا۔ لیکن اس کا ایک انتہائی مثبت پہلو یہ ہے کہ موت سے پہلے صدام حسین نے ای میل کے ذریعے اپنی قوم کے نام ایک پیغام دیا۔ اِس پیغام میں انھوں نے کہا تھا کہ — تم لوگ امریکا سے نفرت نہ کرو، کیوں کہ نفرت، سوچنے کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔ انگریزی رپورٹنگ میں اس کے الفاظ یہ تھے:

I call on you, not to hate Americans,
because hate closes all doors of thinking.

پچھلے دو سو سال کی مسلم تاریخ اِس کا کھلا ہوا نمونہ ہے۔ نوآبادیات (Colonialism) کے زمانے میں مسلمان، مغربی قوموں سے سخت نفرت کرنے لگے، پھر صیہونیت (Zionism) کے عنوان سے یہودی نفرت شروع ہوئی، پھر امریکیت (Americanism) سے وہ شدید طور پر متنفر ہو گیے۔ اور امریکا کو اسلام کا دشمن نمبر ایک کہنے لگے۔ اِسی کا ایک مظاہرہ 11 ستمبر 2001 کا واقعہ تھا جو نیویارک میں پیش آیا۔

پچھلے دو سو سال کے اندر پوری مسلم دنیا میں نفرت کا یہی ماحول چھایا رہا ہے۔ اِس مدت میں پیدا ہونے والی تمام بڑی بڑی شخصیتیں نفرت کا شکار ہو کر رہ گئیں — سید جمال الدین افغانی، آیت اللہ خمینی، جمال عبد الناصر، اسامہ بن لادن، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور صدام حسین وغیرہ۔ اِس مدت میں پوری مسلم دنیا میں لوگ نفرت میں مبتلا رہے۔ اِس بنا پر یہ ہوا کہ ان کے اندر مثبت سوچ کا ارتقا نہ ہو سکا۔ یہ صورتِ حال ابھی تک بدستور جاری ہے جس نے مسلمانوں کے اندر مثبت سوچ کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔

سپردگی کی اسپرٹ

اسلام کا مطلب سپردگی (submission) ہے۔ یہی اسلام کی اصل اسپرٹ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ اسپرٹ بھرپور طور پر پیدا ہوجائے اس کے اندر فطری طور پر سپردگی کا مزاج (submissive nature) جنم لیتا ہے۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں تمثیل کی زبان میں اس طرح بتائی گئی ہے کہ مؤمن کی مثال میدان میں اُگے ہوئے نرم پودے جیسی ہے (مثل المؤمن کمثل خامة الزّرع) ہوا کا جھونکا آتا ہے تو وہ اس کے مقابلے میں نرمی کے ساتھ جھک جاتا ہے، وہ ایسا نہیں کرتا کہ کڑی چیز کی طرح کھڑا رہے خواہ وہ اس کے نتیجے میں ٹوٹ جائے۔

مومن کے اندر سپردگی کا یہ مزاج اصولی طور پر یا اعتقادی طور پر صرف خدا کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن اس کا عملی اظہار ہمیشہ انسان کی نسبت سے پیش آتا ہے۔ کیوں کہ خدا اِس دنیا میں براہِ راست طور پر ہمارے سامنے موجود نہیں۔ عملی طور پر ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ خدا کی بات کسی انسان کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔ یہ انسان ہے جو موجودہ دنیا میں خدا کی بات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اِس لیے خدا کے لیے سپردگی کا امتحان ہمیشہ انسان کی نسبت سے لیا جاتا ہے نہ کہ براہِ راست خدا کی نسبت سے۔

یہ بات قرآن میں آدم اور ابلیس کے واقعے سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم کو پیدا کرنے کے بعد خدا نے جن اور ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جھکیں۔ مگر ابلیس نہیں جھکا۔ اس کے نتیجے میں ابلیس کو خدا کا نافرمان قرار دیا گیا۔ ابلیس خدا کے آگے سجدہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر وہ اِس کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ آدم کے آگے سجدہ کرے۔ مگر اس کا سجدۂ خداوندی قبول نہیں گیا، بلکہ سجدۂ انسانی سے انکار کی بنیاد پر اس کو خود خدا کے آگے سجدہ نہ کرنے والا قرار دیا گیا۔

سپردگی کی یہی اسپرٹ مومن کو ہر موقع پر خدا کا تابع دار بنائے رکھتی ہے۔ جن لوگوں کے اندر سپردگی کی یہ صفت نہ ہو وہ سرکشی کا طریقہ اختیار کریں گے اور بطور خود یہ سمجھیں گے کہ ان کی منفی روش صرف ایک انسان کے مقابلے میں ہے، نہ کہ خدا کے مقابلے میں۔

زمانی بصیرت رکھنے والے علماء کی ضرورت

سوسال سے بھی زیادہ مدت سے یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ ہمیں دورِ جدید کے علماء کی ضرورت ہے، یعنی ایسے علماء جو علومِ دینیہ کی تحصیل کے علاوہ وقت کے علوم کی بھی تعلیم حاصل کریں۔ اس طرح ایسے علماء تیار ہوں جو قدیم وجدید دونوں سے واقف ہوں تاکہ وہ عصر حاضر کے مطابق، اسلام کی خدمت انجام دے سکیں۔

حال میں اِس ضرورت کو مزید شدت کے ساتھ دہرایا جارہا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ اِس موضوع پر لکھنے اور بولنے والے بظاہر یہ تاثر دے رہے ہیں گویا کہ اس موضوع پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا، مگر یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ پچھلے سوسال کے اندر بہت سے لوگوں نے تعلیمی اعتبار سے بظاہر دونوں قسم کی لیاقت حاصل کی، مگر مطلوب نتیجہ حاصل نہ ہوسکا۔ دوطرفہ تعلیم کے باوجود وہ علماء تیار نہ ہوسکے جو عصر حاضر کی اسلامی ضرورت کو پورا کریں۔ اِس معاملے میں جو چیز مفقود ہے، وہ نتیجہ ہے نہ کہ کوشش۔ فقدانِ نتیجہ کو فقدانِ کوشش سمجھا جارہا ہے۔ یہ قلتِ شعور کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایسے لوگوں کی فہرست ہزاروں میں شمار کی جاسکتی ہے جو دونوں قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، مگر وہ ملت کی مطلوب ضرورت کو پورا نہ کرسکے۔ مثال کے طور پر چند نام یہاں لکھے جاتے ہیں— مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، پروفیسر مشیر الحق، ڈاکٹر عبدالحلیم عویس، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی، مولانا محمد تقی عثمانی، پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، پروفیسر محمد اجتبا ندوی، پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، وغیرہ۔

یہ تمام لوگ مدرسہ اور یونیورسٹی دونوں قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ اس قسم کے دوطرفہ سند یافتہ علماء کی فہرست بہت طویل ہے، مگر اِن میں سے کوئی بھی شخص مطلوب ضرورت کو پورا نہ کرسکا، یعنی

قدیم وجدید دونوں کے مطالعے سے فکر اسلامی کی تشکیل وتدوین کرنا، جو دورِ جدید میں دین اسلام کے فکری اظہار کے لیے مطلوب ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اِس قسم کے علماء کی تحریریں پڑھی ہیں، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان سب کی تحریریں قدیم روایتی مسائل کی جدید تکرار کے سوا اور کچھ نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، سرسید احمد خاں نے جب ایک تعلیمی ادارہ بنایا جس نے آخر کار مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ سرسید احمد خاں نے اپنے اِس تعلیمی ادارے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ اس میں ایسے مسلمان تیار ہوں جن کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے ہاتھ میں سائنس ہو۔

اس طرح مسلم ممالک میں بہت سے ایسے ادارے ہیں جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام آباد کی انٹرنیشنل یونیورسٹی، قاہرہ کا جامعۃ الازہر، ریاض کا جامعۃ الامام، لیبیا کی جامعہ طرابلس، وغیرہ۔

اِسی طرح یورپ اور افریقہ میں ایسے مدرسے قائم کیے گیے ہیں جہاں اسلامی علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے اور قرآن اور حدیث کے ساتھ جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں، نیز ایسے بہت سے مسلمان ہیں جنھوں نے ندوہ اور دیوبند جیسے اسلامی اداروں سے فراغت حاصل کی اور اس کے بعد انھوں نے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر باقاعدہ جدید علوم میں بھی ڈگری حاصل کی۔ لیکن اس کے باوجود ایسے علماء تیار نہ ہو سکے جو مطلوب قسم کے علماء کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ مدرسے کے فارغین اگر مدرسے کے استاد بن کر رہ جاتے تھے تو ان لوگوں کو یونیورسٹی میں معاشی اعتبار سے زیادہ بہتر ملازمتیں حاصل ہوگئیں اور ایک عالم کے الفاظ میں وہ زیادہ بہتر قسم کے ''حیوانِ کاسب'' بن کر رہ گیے۔

سند یافتہ علماء کے سوا بہت سے دوسرے مسلم رہنما ہیں جو عربی اور فارسی اور اردو کے سوا مغربی زبان (انگریزی یا فرنچ) بھی جانتے تھے۔ انھیں دونوں طرف کے لٹریچر کا مطالعے کرنے کا موقع ملا، مگر ان کی تحریروں کا ذخیرہ بتاتا ہے کہ وہ بھی دورِ جدید میں اسلام کی اِس فکری ضرورت کو پورا نہ کر سکے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں — سید جمال الدین افغانی، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا

ابوالکلام آزاد، شیخ محمد عبدہ، سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، سید قطب، ڈاکٹر عبد القادر عودہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن الکواکبی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، وغیرہ۔

دوسری قسم کے ان علماء کی تحریریں بھی میں نے پڑھی ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا معاملہ بھی دیگر علماء سے مختلف نہیں۔ ان لوگوں کی تحریریں بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قدیم مسائل وافکار کی جدید تکرار ہیں۔ یہ کتابیں روایتی ذہن کو اپیل کرسکتی ہیں، لیکن وہ جدید ذہن کو ایڈریس نہیں کرتیں۔ جہاں تک دورِ جدید میں اسلام کے فکری اظہار کا معاملہ ہے، وہ ان لوگوں کی تحریروں کے اعتبار سے بدستور نامکمل پڑا ہوا ہے۔ چند مثالوں کے ذریعے اِس معاملے کی وضاحت ہوتی ہے۔

1 - ڈاکٹر محمد اقبال، اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ انھوں نے مذکورہ موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے — الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید:

Reconstruction of religious thought in Islam.

مگر یہ کتاب کسی بھی درجے میں اسلام کی جدید ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ اِس کتاب میں یا تو بعض روایتی مسائل، مثلاً وحدتِ وجود کو دوبارہ دہرایا گیا ہے۔ اس کے سوا اگر کچھ باتیں ہیں، تو وہ فلسفیانہ کنفیوژن کے سوا اور کچھ نہیں۔

زیرِ بحث موضوع کی نسبت سے اقبال کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو صرف منفی نقطۂ نظر کے تحت دیکھ سکے، اور جو آدمی اپنے زمانے کے افکار واحوال کو صرف منفی ذہنیت کے ساتھ دیکھے، وہ کبھی اسلام کی عصری ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔

قرآن کی شہادت کے مطابق، فطرت کا قانون یہ ہے کہ ہر بظاہر منفی چیز میں ایک مثبت پہلو موجود ہو۔ اِس بات کو قرآن میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ خدا کی سنت کے مطابق، ہر عُسر کے اندر ہمیشہ یُسر کا پہلو موجود رہتا ہے، مگر اقبال (اور اِسی طرح دوسرے تمام جدید مسلم علماء) اِس نکتے کو سمجھ نہ سکے۔ ایسی حالت میں وہ سرے سے اس کے اہل ہی نہ تھے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق،

اسلامی فکر کی تدوین کرسکیں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے اقبال کے ایک شعر کو لیجیے:

میں سمجھتا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبال کا یہ شعر جدید تعلیم کے بارے میں ہے، مگر یہ شعر صرف اِس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال جدید علوم کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید علوم، بالفاظ دیگر سائنسی علوم، آفاق وانفس (حم السجدہ 53) میں آیات الٰہی کے اظہار کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن کو مزید وضاحت کے لیے دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مذہب اور جدید چیلنج (God Arises)۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ **الاسلام یتحدّی** کے نام سے چھپا ہے۔ ایک عرب شیخ نے اس کو پڑھ کر کہا تھا کہ اس کا ثانوی ٹائٹل یہ ہونا چاہیے: **مدخل علمي إلى الإيمان** (ایمان میں داخلے کا سائنسی دروازہ)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی جدید علوم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرے گا اور فراستِ ایمانی کے تحت اس کا تجزیہ کرے گا وہ بالکل برعکس نتیجے تک پہنچے گا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ اقبال کا مذکورہ شعر (اور اسی طرح موجودہ زمانے کے تمام علماء کے منفی بیانات) صرف جدید علوم سے ان کی بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ علوم برعکس طور پر معرفت کا نیا دروازہ کھولنے والے ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو اقبال کا مذکورہ شعر ایک لفظی تغیر کے ساتھ اِس طرح کہنا زیادہ صحیح ہے:

میں سمجھتا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا 'ایمان' بھی ساتھ

2- اِسی سے متعلق دوسرا حوالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ہے۔ ان کی ایک عربی کتاب چھپی ہے جس کا ٹائٹل یہ ہے: **ردّة ولا أبا بكر لها** (ایک ارتداد ہے، مگر اس کے لیے کوئی ابوبکر نہیں) اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جو مسلم نوجوان جدید تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ فکری اعتبار سے اسلام کے بارے میں منفی ذہن کے حامل بن جاتے ہیں۔ بظاہر ان کے نام مسلمان جیسے ہوتے ہیں، لیکن اعتقادی اعتبار سے وہ اسلام سے بہت دور ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ذہنی ارتداد کا معاملہ ہے جس سے آج مسلم ملت کی نئی نسل دوچار ہے۔

یہ کتاب پہلی بار 1959 میں **المجمع الاسلامی العلمی** (لکھنؤ) کی طرف سے شائع

ہوئی۔ اِس کو پڑھنے کے بعد میں نے اس مسئلے کی باقاعدہ تحقیق کی۔ مسلمانوں کی جدید نسل (عرب اور غیر عرب دونوں) کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے جیسے لوگ جس چیز کو ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) کہہ رہے ہیں، وہ دراصل ذہنی عدم اطمینان (intellectual discontent) کا کیس ہے۔

اصل یہ ہے کہ آج کا زمانہ سائنسی طرز مطالعہ کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو سائنٹفک فریم ورک میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ آج کے انسان کو صرف وہ استدلالی اسلوب اپیل کرتا ہے جو مبنی بَر عقل (reason-based) ہو، مگر آج کے مسلم مصنفین اور اہلِ علم نے جو اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے، وہ سب کا سب قدیم روایتی اسلوب پر مبنی ہے نہ کہ جدید سائنسی اسلوب پر۔ مثال کے طور پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک کتاب اِس نام کے ساتھ چھپی ہے: 'عقل کا فیصلہ' حالاں کہ اس کتاب میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے، وہ مکمل طور پر نقلی دلیل پر مبنی ہے نہ کہ عقلی دلیل پر۔ (ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب 'فکرِ اسلامی'، صفحہ 216)

اسلام کے خلاف جدید فکری چیلنج کا آغاز مغربی تہذیب کے عروج کے ساتھ پیدا ہوا۔ یہ مغربی تہذیب بیک وقت دو عناصر کے ساتھ مسلم دنیا میں داخل ہوئی۔ نوآبادیاتی سیاست، اور جدید عقلی افکار۔ اس کے مقابلے میں مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا، وہ زیادہ تر پُر جوش ردّعمل کی صورت میں تھا۔ ایک طبقے نے اس کو سادہ طور پر جہاد (بہ معنٰی قتال) کا مسئلہ سمجھا اور مسلّح جہاد کے ذریعے اس کو ختم کرنا چاہا۔ یہ مسلح جہاد بے شمار قربانیوں کے باوجود یک طرفہ نقصان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم اِس بحث میں ہمیں سیاسی ردّعمل یا مسلح جہاد کا جائزہ نہیں لینا ہے، بلکہ صرف فکری ردّعمل کا جائزہ لینا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ مسلم رہنماؤں نے اس مسئلے کے مقابلے میں صرف یہ کافی سمجھا کہ وہ مسلمانوں کو پُر جوش تقریروں اور تحریروں کے ذریعے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں۔ اِس ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حُدی را تیز تر می خواں، چو محمل را گراں بینی!

موجودہ زمانے کے تمام مسلم رہنماؤں نے یہی انداز اختیار کیا۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: ''ستارے ڈوب گیے تو کیا ہوا۔ سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور اُن اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالوں کی سخت ضرورت ہے''۔ مولانا آزاد کے اِن پُرشور الفاظ میں جوشِ خطابت تو ضرور ہے، مگر اس میں کوئی رہنمائی نہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو اِس سے اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے کوئی سمتِ سفر نہیں ملی۔

لکھنؤ کے ایک مشہور مسلم ادارے سے ایک عربی ماہ نامہ نکلتا ہے، جس کا نام ''البعث الاسلامي'' ہے۔ اس کے ٹائٹل پر ہمیشہ یہ الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں: **شعارنا الوحيد إلى الإسلام من جديد** (ہمارا واحد ماٹو یہ ہے کہ از سرِ نو اسلام کی طرف لوٹا جائے) اِس ماہ نامے میں اور اِس طرح کے دوسرے اخباروں اور ماہ ناموں میں اِسی طرح کے پُر جوش الفاظ چھپتے رہتے ہیں، مگر اِن میں دورِ جدید کی نسبت سے مسلمانوں کے لیے کوئی ذہنی غذا موجود نہیں ہوتی۔

ایک عرب ملک کے عربی روزنامے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک بڑے مسلم لیڈر کی تقریر چھپی ہوئی ہے۔ اِس تقریر میں انھوں نے پُر جوش طور پر کہا تھا: **الاسلام قدر البشرية** (اسلام انسانیت کی تقدیر ہے):

Islam is the destiny of mankind.

یہ الفاظ بظاہر نہایت شان دار معلوم ہوتے ہیں، لیکن پوری تقریر سے آج کا انسان یہ معلوم نہیں کرسکتا کہ اسلام کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کو ''تقدیر انسانی'' کا درجہ ملا ہوا ہے۔ پوری تقریر مدّعیانہ جوش کے انداز میں تھی نہ کہ علمی دلائل کے انداز میں۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق اپنے زمانۂ صدارت میں نیویارک گیے۔ وہاں انھوں نے یکم اکتوبر 1980 کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ — مسلمانوں نے دوبارہ اسلام میں اپنا فخر دریافت کرلیا ہے:

Muslims have rediscovered their pride in Islam.

موجودہ زمانے میں جب مغربی علوم مسلم دنیا میں آئے تو اُس وقت مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ اصل ضرورت صرف یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو قدیم موضوعات کی تعلیم کے ساتھ جدید موضوعات کی تعلیم بھی حاصل کریں۔ گویا کہ وہ ایک طرف دینی مدرسے سے وہاں کی سند لیں اور اسی کے ساتھ سیکولر تعلیمی اداروں سے بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرلیں، مگر یہ اصل صورتِ حال کا نہایت کم تر اندازہ تھا۔

اس معاملے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ جدید ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمیں جس قسم کے افراد کی ضرورت ہے، وہ سادہ طور پر سند یافتہ یا ڈگری یافتہ عالم نہیں ہیں، بلکہ وہ تخلیقی (creative) عالم ہیں۔ ہمیں مفکر کی ضرورت ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف عالم کی۔ سند یافتہ عالم یا ڈگری یافتہ مسٹر اُس ضرورت کو پورا کرنے کا سرے سے اہل ہی نہیں جو آج ہم کو درپیش ہے۔

مروّجہ اصول تعلیم کے مطابق، یہ ہوتا ہے کہ مدرسوں میں کلاسکل کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح یونیورسٹیوں میں بھی جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، وہ کلاسکل کتابوں کے اوپر مبنی ہوتا ہے۔ گویا کہ مدرسہ اور یونیورسٹی دونوں میں علوم ماضی پڑھائے جاتے ہیں۔ تخلیقی معنوں میں علوم جدید دونوں میں سے کہیں نہیں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس معاملے کی وضاحت کے لیے یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

حدیث کی تمام کتابوں میں صحیح البخاری سب سے زیادہ مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کی تشریح میں ابن حجر العسقلانی نے فتح الباری بشرح صحیح البخاری لکھی ہے جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ فتح الباری اتنی جامع کتاب ہے کہ اس کو حدیث کا انسائکلو پیڈیا کہا جاتا ہے۔

صحیح البخاری میں کتاب الجنائز کے تحت ایک روایت آئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک راستے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہاں سے ایک جنازہ گذرا۔ کچھ لوگ ایک جنازے کو اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جارہے تھے۔ روایت کے مطابق، یہ ایک یہودی عالم (حبر من الیھود) کا جنازہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس جنازے کو دیکھ کر اس

کے احترام میں کھڑے ہوگیے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا: أليست نفساً (کیا وہ انسان نہیں)

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری، جلد 3، صفحہ 214)

صحیح البخاری تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ حدیث واضح طور پر احترام انسانیت کی حدیث ہے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب وملت کے فرق کے بغیر ہر انسان کا یکساں طور پر احترام کیا جائے۔ اس واضح تعلیم کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد اور مدارس میں انسانیت کے اِس عمومی احترام کا کوئی تصور نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تبلیغی جماعت مسلمانوں کی سب سے بڑی دینی جماعت ہے۔ اِس جماعت کے بانی اور رہنما سب کے سب علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس جماعت کے اصول میں ''اکرامِ مسلم'' تو ہے، لیکن اکرامِ انسان کا ذکر بطور اصول اس میں موجود نہیں۔

احترام انسان کی اِس واضح تعلیم کے باوجود ہمارے مدارس اور مساجد میں کیوں ایسا ہے کہ اس کا ماحول ہمارے مدارس اور مساجد میں موجود نہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ احترامِ انسان کی مذکورہ حدیث کو ہمارے فارغینِ مدارس جن کتب شرح کے ذریعے پڑھتے ہیں، اُن کتابوں میں حدیث کا یہ مفہوم سرے سے موجود ہی نہیں۔ فتح الباری نہایت مستند شرح سمجھی جاتی ہے، لیکن آپ اِس حدیث کی شرح فتح الباری میں پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ فتح الباری میں اِس حدیث کی دس سے زیادہ تاویلیں موجود ہیں، لیکن اس میں وہی تاویل موجود نہیں جو حدیث کا اصل مقصود ہے، یعنی احترامِ انسانیت۔

یہ تمام شرحیں اِس مفروضے پر قائم ہیں کہ غیر مسلم کا احترام مسلمانوں کے لیے کوئی مطلوب چیز نہیں، مسلمانوں کو مسلمانوں کا احترام کرنا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا۔ فتح الباری میں اِس حدیث کی شرح کے تحت بہت سے علماء کی رائیں نقل کی گئی ہیں۔ ان تمام رایوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہودی کے جنازے کے احترام میں نہیں اٹھے، بلکہ آپ کے اٹھنے کا سبب کچھ اور تھا۔

مثلاً کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں کے احترام میں اٹھے جو جنازے کے ساتھ چل رہے تھے (إنما قمنا للملائكة)، کسی نے کہا کہ جنازے کے بخور (دھونی) کی بو سے آپ کو اذیت پہنچی، اِس لیے آپ کھڑے ہو گیے (فاذاه ريح بخورها)، کسی نے کہا کہ جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ آپ نے اس کو پسند نہیں کیا، اس لیے آپ کھڑے ہو گیے (كراهية أن تعلو رأسه)، کسی نے کہا کہ آپ نے شروع میں ایسا کیا تھا اور بعد میں آپ نے اس کو ترک کر دیا، اس لیے اب یہ طریقہ منسوخ ہے (أنه ترك بعد فعله، فالأمر بالقيام منسوخ)، کسی نے کہا کہ آپ نے ایسا صرف بیانِ جواز کے لیے کیا تھا (كان قعوده لبيان الجواز)، وغیرہ۔

صحیح البخاری میں کوئی شخص اِس حدیث کو پڑھے تو وہ اس سے یہ اخذ کرے گا کہ اسلام میں انسان کے احترام کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ احترام انسان اسلام کا ایک اعلیٰ اصول ہے۔ لیکن جب آپ اِس حدیث کو شارحینِ حدیث کی کہی ہوئی باتوں کی روشنی میں دیکھیں تو یہ تاثر بالکل بدل جائے گا۔ اس حدیث میں آپ کو احترامِ انسانیت کا کوئی سبق نہیں ملے گا۔ پچھلی صدیوں میں عملاً یہی پیش آیا۔ ہمارے مدارس سے لاکھوں لوگ صحیح البخاری پڑھ کر نکلے، مگر میرے علم کے مطابق، کسی نے اس حدیث کو احترامِ انسانیت کی تعلیم کے طور پر نمایاں نہیں کیا۔ حالاں کہ دورِ جدید کی نسبت سے یہ حدیث بے حد اہمیت رکھتی ہے۔

دورِ جدید میں تمام انسانوں کا یکساں احترام ان کے مطلق حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے یہ حدیث دورِ جدید کے انسانوں کے لیے بہت زیادہ اہم ہے، مگر مدرسوں میں کلاسکل لٹریچر کو پڑھ کر جو لوگ نکلتے ہیں، وہ صرف تقلیدی ذہن کے حامل ہوتے ہیں، وہ تخلیقی فکر (creative thinking) سے عملاً پوری طرح خالی ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوا کہ قدیم کتابوں میں اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھ دیا گیا تھا، اس کو انھوں نے آخری سمجھ لیا۔ اور تخلیقی غور و فکر کے ذریعے حدیث کے غیر روایتی معنیٰ کو دریافت کرنے میں وہ ناکام رہے۔

اب یونیورسٹی ایجوکیشن کی ایک مثال لیجیے۔ موجودہ زمانے کی تمام یونیورسٹیوں میں ارتقاءِ حیات

کے نظریے کو بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے، جس کو عام طور پر ڈراوِن ازم (darwinism) کہا جاتا ہے۔ وہ تمام لوگ جو یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلتے ہیں، وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو اِس طرح مانتے ہیں جیسے کہ وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہو۔ ان کا یہ عقیدہ اس لیے بنتا ہے کہ یونیورسٹی نصاب کے تحت، وہ جن کتابوں کو پڑھتے ہیں ان میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے اور اس کی تقلید میں ان کا پروفیسر اس موضوع کو اسی طرح پڑھاتا ہے۔ حالاں کہ یونیورسٹی نصاب کے باہر ایسی بہت سی کتابیں لکھیں گئی ہیں اور چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، جن میں اس نظریے کو سرتاسر بے بنیاد ثابت کیا گیا ہے، مثلاً لُون (Lunn) کی کتاب — روولٹ اگینسٹ ریزن (Revolt Against Reason)، وغیرہ۔

نظریۂ ارتقاء کو میں نے تفصیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انواعِ حیات کے جسمانی ڈھانچے میں مشابہت (similarity) پائی جاتی ہے۔ مثلاً بلّی اور شیر کا ڈھانچہ ایک دوسرے کے مشابہہ ہے۔ بکری اور زرافہ کا ڈھانچہ ایک دوسرے سے مشابہہ ہے۔ بندر اور انسان کا ڈھانچہ ایک دوسرے سے مشابہہ ہے۔ اس ظاہری مشابہت کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا کہ مختلف انواع کے درمیان ایک ارتقائی رشتہ ہے، یعنی بلی میں عضویاتی ارتقا ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ شیر بن گئی۔ بکری میں عضویاتی ارتقاء ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ زرافہ بن گئی۔ بندر میں عضویاتی ارتقاء ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ انسان بن گیا۔

یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ مشاہدے کے ذریعہ جو چیز دریافت ہوئی تھی، وہ صرف مشابہتِ انواع ہے، لیکن بے بنیاد قیاس کے تحت یہ فرض کرلیا گیا کہ مشابہتِ انواع دراصل ارتقاءِ انواع کو بتا رہا ہے۔ حالاں کہ اِس قسم کا قیاس سرتاسر بے اصل ہے۔

اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ آپ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے استنباط (inference) کو منطقی طور پر درست سمجھتے ہیں۔ اصحابِ ارتقاء بھی اِسی استنباط کے ذریعے اپنے نظریے کو ثابت کرتے ہیں، پھر کیوں آپ اس کو نہیں مانتے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک مغالطے کی بات ہے۔ اس لیے کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ثابت شدہ

واقعے کی توجیہہ کے لیے استنباط کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ:

Where there is a design there is a designer.

اِس کے برعکس، نظریۂ ارتقاء کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک غیر ثابت شدہ واقعے کی توجیہہ کے لیے استنباط کے طریقے کو استعمال کیا گیا ہے، یعنی مختلف انواع کے درمیان ارتقائی عمل خود غیر ثابت شدہ ہے، مگر اس غیر ثابت شدہ عمل کو لے کر وہ حیاتیاتی فلسفہ بنا لیا گیا جس کو ڈارون ازم کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید دور میں ہمیں صرف عالم کی ضرورت نہیں، بلکہ عالمِ مفکر کی ضرورت ہے۔ صرف عالم دورِ جدید میں اسلام کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے جو سب سے بڑا مسئلہ پیدا ہوا، وہ یہ تھا کہ مغربی قوموں نے مسلمانوں کے ہزار سالہ سیاسی دبدبے کو ختم کردیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ اِس کو سمجھنے کہ لیے نہ مدرسی تعلیم کافی تھی اور نہ یونیورسٹی کی تعلیم۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے تخلیقی فکر درکار تھی۔ چوں کہ دونوں طرف کے اصحاب علم میں تخلیقی فکر مفقود تھی، اِس لیے اس معاملے میں کوئی بھی شخص مسلمانوں کو صحیح رہنمائی نہ دے سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید میں مسلمانوں کے سیاسی غلبے کا ختم ہونا، ایک اضافی چیز تھی۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ جدید انقلاب نے ساری دنیا میں سائنسی دور پیدا کردیا۔ تاریخ میں یہ جو تبدیلی پیش آئی، وہ عین اسلام کے حق میں تھی۔ جدید سائنسی دور اسلام کا معاون دور تھا نہ کہ کوئی رقیبانہ دور۔

اِس معاملے کو میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے دنیا میں جو انقلاب آیا، اُس انقلاب نے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کیا۔ اِسی پراسس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ دنیا میں سائنسی دور پیدا ہوا، یعنی فطرت کا مطالعہ کرکے فطرت کے اُن قوانین کو دریافت کرنا جن کو قرآن میں آیاتِ آفاق اور آیاتِ انفُس (حم السجدہ: 53) کہا گیا ہے۔

اِس انقلاب کا ایک بے حد اہم پہلو یہ تھا کہ اِس نے تاریخ میں پہلی بار دلیل کو تلوار کا قائم مقام بنا دیا۔ پہلے زمانے میں اسلامی دعوت کا کام تلوار کا مقابلہ کر کے کرنا پڑتا تھا، اب یہ ممکن ہو گیا کہ کسی بھی قسم کے تشدد کے بغیر صرف دلیل کی طاقت سے اسلامی دعوت کا فریضہ ادا کیا جائے۔

یہ ایک عالمی اصول ہے کہ ہر تہذیب کے دو حصے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح مغربی تہذیب کے بھی دو حصے ہیں۔ اِن میں سے ایک حصے کو سائنس اور دوسرے حصے کو کلچر کہا جا سکتا ہے۔ سائنس، انسانی فلسفوں میں سے ایک فلسفہ نہیں ہے۔ سائنس تمام تر قوانینِ فطرت کی دریافت کا نام ہے۔ یہ فطرت کے قوانین براہِ راست خدا کے قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ قوانین نہ مغربی ہیں اور نہ مشرقی۔ وہ نہ مغربی ہیں اور نہ سیکولر۔ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، براہِ راست خدا کے حکم سے ہماری دنیا میں قائم ہیں۔ ان قوانین کو سائنس نے لمبی کوشش کے بعد دریافت کیا اور اس کو ایک علم کی صورت میں مدوّن کیا۔

یہ سائنسی علم اہلِ اسلام کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ غیر اہلِ اسلام کے لیے۔ یہ علم یکساں طور پر ہر ایک کے لیے مفید اور قابلِ قبول ہے۔ اِس سائنسی علم کا ایک پہلو وہ ہے جس کو ٹکنالوجی کہا جاتا ہے۔ ٹکنالوجی کے ذریعے مشین اور دوسری مادّی چیزیں بنتی ہیں۔ یہ چیزیں انسانی تمدّن کے لیے کارآمد ہیں، جیسے کار، ہوائی جہاز اور ٹیلی فون، وغیرہ۔

سائنسی علم کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو نظریاتی سائنس کہا جاتا ہے۔ مثلاً شمسی نظام کا علم، زمین کی گردش کا علم، بارش اور نباتات کا علم، وغیرہ۔ یہ دوسرا علم عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں آیاتِ آفاق وانفس کہا گیا ہے۔ اِس علم کو قرآن میں آیاتِ الٰہیہ کا نام دیا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے اعتقادات کو علمی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سائنسی علم دورِ جدید کا علمِ کلام ہے۔ اس سائنسی علم نے تاریخ میں پہلی بار ایسا کیا ہے کہ عقلی دلیل واحد فیصلہ کُن چیز بن گئی ہے۔ اس کی وجہ سے اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دینِ توحید کی صداقت کو کسی بھی تشدّد کے بغیر صرف نظریاتی دلائل کے ذریعے ایک ایسی ثابت شدہ چیز بنا دیا

جائے جس کو ماننے کے لیے انسان کی عقل مجبور ہو۔

مغربی تہذیب کا دوسرا حصہ اس کا کلچر ہے۔ یہ کلچر اہلِ مغرب کی قومی چیز ہے۔ سائنسی علم سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً مغربی قوموں میں موجودہ زمانے میں اباحیت پسندی اور عریانیت پیدا ہوئی ہے، مگر اس اباحیت اور عریانیت کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مغربی قوموں کی اپنی پیداوار ہے۔ تاریخ کے قدیم زمانے میں بھی اِس قسم کی اباحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً قومِ لوط میں اباحیت ایسے انتہائی درجے تک پہنچ گئی تھی کہ خدا نے ان کو آسمانی عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیا۔

مغربی قوموں میں جو بے قید آزادی پیدا ہوئی اس کی ذمے داری بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر خود مسلم رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی سائنس فطرت پر عقلی غور وفکر کے ذریعے پیدا ہوئی۔ اس بنا پر جب سائنس کا عروج ہوا تو اسی کے ساتھ عقلی غور وفکر کا بھی عروج ہو گیا۔ اب فطری طور پر ایسا ہوا کہ موجودہ زمانے کے اہلِ علم مذہب کو بھی عقلی معیاروں پر جانچنے لگے۔

اب ضرورت تھی کہ مسلم رہنما اسلام کی تعلیمات کو ایسے عقلی اور سائنسی دلائل کے ذریعے پیش کریں جو آج کے انسان کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا ہو، مگر مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہوا کہ وہ مغربی سائنس اور مغربی کلچر کے درمیان فرق کو سمجھنے سے عاجز رہے اور انھوں نے مغربی تہذیب کو اسلام دشمن سمجھ کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ اسلام کو عقلی دلائل پر پیش کرنے کے بجائے جدید نسل کے لوگوں کو ملحد اور مرتد قرار دے کر ان کے خلاف فتوے کی زبان بولنے لگے۔ حالاں کہ یہاں فتویٰ ایکٹوزم نہیں بلکہ سائنسی ایکٹوزم کی ضرورت تھی۔

مسلم رہنماؤں کی یہی وہ بھیانک غلطی ہے جس نے سارے مسائل پیدا کیے۔ اِسی غلطی کا یہ نتیجہ تھا کہ سائنسی انقلاب جو دینِ حق کی تائید کے طور پر آیا تھا۔ وہ دین حق کا رقیب اور حریف بن کر رہ گیا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا کہ موجودہ زمانے میں سند یافتہ علماء اور ڈگری یافتہ رہنما تو بہت پیدا ہوئے، لیکن ہمارے ادارے کوئی تخلیقی مفکر پیدا نہ کر سکے۔

راقم الحروف نے خدا کے فضل سے اِس میدان میں ذاتی محنت کے ذریعے اتنا زیادہ کام کیا

ہے جو وقت کی اِس کمی کو بھرپور طور پر پورا کرسکتا تھا، لیکن **بدء الاسلام غریباً و سیعود کما بدأ** کے مطابق، ایسا ہوا کہ روایتی ذہن کی بنا پر لوگ اس کی اہمیت کو سمجھنے سے عاجز رہے اور اس کے جواب میں انھوں نے انتہائی نادانی کے ساتھ منفی ردعمل کا ثبوت دیا۔ یہ تاریخ جدید کا ایک پراسس تھا۔ ان حضرات پر فرض تھا کہ وہ اس پراسس کا حصہ بنیں، لیکن انھوں نے اس پراسس کا حصہ بننے کے بجائے اس کی مخالفت کو بے بنیاد طور پر اپنی ذمے داری سمجھ لیا۔

یہ تمام لوگ جس جدید علمی اور فکری ضرورت کا تقاضا کررہے تھے، عملاً وہ چیز ظاہر ہوئی لیکن عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اس کے مقابلے میں **ولا تکونوا أوّل کافر به** کا مصداق بن کر رہ گیے۔

تراجم — 'تذکیر القرآن'

'تذکیر القرآن' کے ہندی اور انگریزی ترجموں کے بعد اب دیگر مقامی زبانوں — تلگو، تامل، آسامی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، بنگالی، اُڑیا، کنڑ، نیز مختلف عالمی زبانوں — جرمن، فرنچ، اسپینش، روسی، جاپانی اور چینی، وغیرہ میں اُس کا ترجمہ اور اشاعت مطلوب ہے۔ جو حضرات 'تذکیر القرآن' کے ترجمہ اور کمپوزنگ اور اشاعت کا دعوتی کام کرنا چاہتے ہوں، وہ ادارے کو اپنا مخلصانہ تعاون دیں، اور اپنے مکمل پتے سے آگاہ فرمائیں۔ اِس سلسلے کے تمام اخراجات ادارے کے ذمّے ہوں گے۔

تفریق کیا ہے

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ایک اہم اجتماعی تعلیم دی گئی ہے، اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور تم لوگ اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑلو، اور متفرق نہ ہوجاؤ'' (آلِ عمران: 103)

مفسرین نے اِس آیت کی تفسیر کے تحت اُس حدیث کو نقل کیا ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھلی امّتیں بہتّر فرقوں میں بٹ گئیں اور تم لوگ تہتّر فرقوں میں بٹو گے۔ ان میں ہر جماعت گمراہ ہوگی، سوا اُس جماعت کے جو رسول اور اصحابِ رسول کے طریقے پر ہو (ما أنا علیه وأصحابی، الترمذی)

صحیح مسلم میں یہ روایت آئی ہے کہ خدا قیل و قال اور کثرتِ سوال کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ (القرطبی، جلد 4، صفحہ 164) اس حدیث میں کثرتِ سوال سے مراد یہ ہے کہ آدمی نصوص میں خوض کرکے نیے نیے نکتے نکالے اور اِن نکتوں کی بنیاد پر نصوص کی خودساختہ تعبیر کرنے لگے۔ اِن خودساختہ تعبیرات پر اصرار کرنے ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امت متفرق گروہوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر گروہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہی حق پر ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کی معلومات، اور دوسری چیز ہے حکمت اور بصیرت (wisdom)۔ معلومات نصوص کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہیں، لیکن وہ چیز جس کو حکمت اور بصیرت کہا جاتا ہے اس کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف۔ اِس بات کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: واتقوا اللہ ویعلّمکم اللہ (البقرۃ: 282) اسی بات کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ (البیہقی) حکمت کا سر اللہ کا خوف ہے۔ دین سے سادہ فہم کے لیے معلوماتی علم کافی ہے، لیکن دین کی تشریح و تعبیر گہری بصیت کے بغیر ممکن نہیں۔

اِس معاملے پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تفرّق فی الدین عوام کا فتنہ نہیں،

اصلاً یہ خواص کا فتنہ ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو ذہین تو ہو لیکن خوفِ خدا والی بصیرت اس کے اندر موجود نہ ہو، وہ قرآن اور حدیث کو پڑھ کر ایک غیر ضروری نکتہ نکالتا ہے۔ اس نکتے کی کاٹ کے لیے اس کے اندر گہری بصیرت موجود نہیں ہوتی، اس لیے وہ نکتے کو درست سمجھ کر اس کا پرچار شروع کر دیتا ہے۔ دھیرے دھیرے کچھ اور سادہ لوح افراد اس کے گرد اکھٹا ہو جاتے ہیں۔ اِس طرح ایک فرقہ وجود میں آجاتا ہے۔ چند نسلوں کے بعد فطری اسباب کے تحت، اس میں تعصّب کا عُنصر شامل ہو جاتا ہے، یہاں پہنچ لوگ اُس فرقے سے اِس طرح جُڑ جاتے ہیں کہ اُن کے لیے اُس سے جدائی ممکن نہیں ہوتی، کیوں کہ دلیل کا جواب تو دلیل کے ذریعے دیا جاسکتا ہے، لیکن دلیل کے ذریعے تعصب کی دیوار کو توڑا نہیں جاسکتا۔ اِس طرح ایک کے بعد ایک فرقے بنتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد ستّر سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

تفرق فی الدین کیا ہے۔ تفرّق فی الدین دراصل تعبیرِ دین میں اختلاف کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ دین کی تعبیر، دین کی ایک فطری ضرورت ہے، لیکن تعبیر اور نکتہ آفرینی میں فرق ہے۔ حقیقی یا صحیح تعبیر وہ ہے جو علمی تجزیے میں پوری اُترے۔ جو نصوصِ دین کے مجموعی مطالعے سے درست ثابت ہو۔ جو "ما أنا عليه و أصحابي" کا بدلے ہوئے حالات میں انطباق (application) کے ہم معنیٰ ہو۔ جس سے مقتضیاتِ دین میں کوئی تضاد واقع نہ ہوتا ہو۔

اِس کے برعکس، نکتہ آفرینی وہ ہے جو کچھ افراد کے ذاتی ذوق کو تسکین دیتی ہو، لیکن وسیع تر علمی تجزیے میں وہ اپنی صحت کو ثابت نہ کر سکے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ اسلام کا نشانہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کا مقصد زمین پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ اس نظریے کے ثبوت میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں: إن الحكم إلّا الله (یوسف: 40) مگر یہ حوالہ بداہتاً درست نہیں۔ آیت کے سیاق وسباق کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت فوق الفطری حُکم کے معنیٰ میں ہے نہ کہ سیاسی حکم کے معنیٰ میں، جیسا کہ اس کے دعوے دار بتاتے ہیں۔ اِس مثال سے نکتہ آفرینی اور حقیقی تشریح وتعبیر کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اِس معاملے کو اِس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں تشریح دین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، اجتہاد صحیح اور دوسرے، تفسیر بالرائے۔ اجتہاد صحیح وہ ہے جو تمام متعلق نصوص کے مطابق ہو۔ اُس سے شرعی احکام میں کوئی تضاد نہ پیدا ہوتا ہو۔ اس کے مقابلے میں تفسیر بالرائے وہ ہے جو ایک شخص کی ذاتی رائے ہو، لیکن جب اس کو متعلق نصوص پر رکھ کر جانچا جائے تو درست ثابت نہ ہو سکے۔ اس معاملے کی مزید وضاحت کے لیے چند مثالوں کو لیجیے۔

1- حدیث میں آیا ہے کہ: **مَن قال لاالٰہ إلاّ اللہ دخل الجنة** (صحیح البخاری) اِس حدیث کو اور اِس قسم کے دوسرے نصوص کو لے کر کچھ لوگوں کے دماغ میں آیا کہ جنت میں داخلے کے لیے صرف ایمان کافی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس معلومات تو تھیں، لیکن اُن کے اندر گہری بصیرت موجود نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے اِس حدیث کو لفظی معنوں میں لے کر یہ رائے بنائی کہ جنت کے حصول کے لیے صرف ایمان کافی ہے۔ اگر ان کے اندر گہری بصیرت ہوتی تو ان کی بصیرت ان کے لیے مُہیمن بن جاتی اور وہ سمجھ لیتے کہ اِس قسم کی رائے محض ایک بے بنیاد نکتہ ہے وہ کوئی حقیقی نظریہ نہیں، لیکن گہری بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے اس نکتے کا بے اصل ہونا اُن کی سمجھ میں نہ آیا، وہ اپنے اس نکتے پر اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ اس کی بنیاد پر ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔ اس فرقے کے لوگوں کی طرف اس قسم کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

لیس للہ عزّوجلّ علیٰ خلقه فریضة سوی الإیمان به، فمن اٰمن به فلیفعل ماشاء۔

الطاعة لیست من الإیمان (القرطبی، جلد 4، صفحہ 162)

اس قسم کی بات کرنے والوں کے پاس اگر تقویٰ اور بصیرت کا سرمایہ ہوتا تو وہ اِس معاملے پر غور کرتے ہوئے دوسرے نصوص کو بھی ضرور سامنے رکھتے اور پھر وہ پا لیتے کہ جنت محض کسی قسم کے تلفّظ لسانی کی بنا پر کسی کو نہیں ملے گی، بلکہ یہ سارا معاملہ تعمیر شخصیت کا معاملہ ہے۔ جنت دراصل اُس سعادت مند روح کے لیے ہے جو تزکیہ یافتہ شخصیت لے کر آخرت میں حاضر ہو (**ذلک جزاء من تزکّی**، طٰہٰ: 76) اور جو شخص تزکیہ کے درجے میں اسلام کا حامل بن جائے اس کے لیے قول اور عمل میں کوئی فرق باقی

نہیں رہتا۔ اس کا ایمان ایک ایسی معرفت پر کھڑا ہوتا ہے جو پوری انسانی شخصیت کے اندر انقلاب کے ہم معنٰی بن جائے۔

2- قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے: **ومَن لم یحکم بما أنزل الله فاولئک هم الکافرون** (المائدہ: 44) یعنی جو شخص اُس (قانون) کے مطابق، فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ منکر ہیں۔ اِس آیت کو لے کر کچھ لوگوں نے یہ نظریہ بنایا کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ ایسا کر کے کافر ہو جاتا ہے۔ اِس جماعت کا ایک قول اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: **مَن حاکم إلیٰ مخلوق فهو کافر** (القرطبی، جلد 4، صفحہ 161)

اِس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کی ایک آیت کو لیا اور دوسری متعلق آیتوں کو سامنے رکھے بغیر اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فعل کا غلط ہونا تعمُّد قلب پر موقوف ہے (البقرہ: 225)۔ جس فعل میں آدمی کا قلبی ارادہ شامل نہ ہو وہ اس کے لیے ذمّے دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔

شرعی حکم کی کچھ شرطیں ہوتی ہیں، اِن شرطوں کی موجودگی کے بغیر وہ حکم متحقق نہیں ہوتا۔ مثلاً ہر حکم کے ساتھ یہ لازمی شرط جُڑی ہوتی ہے کہ آدمی اس کی استطاعت رکھتا ہو (**اتقوا الله ما استطعتم**، التغابن: 16) اِس اصول کو شریعت میں تکلیف بقدرِ وُسع (البقرہ: 286) کہا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ہندستان کے مسلمان اگر حکم شریعت کے مطابق، فیصلہ نہ کریں تو وہ مذکورہ آیت کا مصداق نہیں ٹھیریں گے۔ اس لیے کہ ہندستان میں مسلمانوں کو نفاذِ شریعت کا اختیار حاصل نہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی ذمے داری ان کے دائرۂ اختیار کے اعتبار سے متعین ہوگی نہ کہ فہرستِ احکام کے اعتبار سے۔ چناں چہ ہندستان میں مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے جس کا اِس دورِ آزادی میں انھیں پورا اختیار حاصل ہے۔

اسی طرح پاکستان کے مسلمان بھی اگر شرعی احکام کا نفاذ نہ کریں تو اِس بنا پر وہ ''کافر'' نہیں

قرار پائیں گے۔ اس لیے کہ پاکستان کا معاشرہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ ہے اور بگڑے ہوئے معاشرے میں اسلامی عمل کا آغاز احکام کے نفاذ سے نہیں ہوتا، بلکہ اِس سے ہوتا ہے کہ غیر سیاسی سطح پر اصلاحی کوشش کے ذریعے معاشرے کے اندر احکام کی قبولیت کی استعداد پیدا کی جائے۔

3- اِس طرح کچھ لوگوں نے قرآن اور حدیث میں جہاد کے احکام پڑھے۔ اِن احکام کو پڑھ کر اُن کے ذہن میں جہاد کی اہمیت کا ایک غُلو آمیز تصور قائم ہوا۔ اِس غلو آمیز تصور کی بنا پر انھوں نے جہاد کو فرضِ عین کا درجہ دے دیا۔ انھوں نے یہ نظریہ بنایا کہ جو شخص جہاد کو چھوڑ دے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تو وہ کافر ہو گیا:

أنّ من ترک الجهاد من ذکر أو أنثیٰ کفر (القرطبی، جلد4، صفحہ 161)

جہاد کے بارے میں یہ نظریہ یقینی طور پر بے بنیاد ہے۔ یہ لوگ جہاد کو اُسی طرح ابدی سمجھتے ہیں جس طرح نماز ایک ابدی حکم ہے، مگر جہاد کا معاملہ ایسا نہیں۔ دیگر نصوص کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد (بہ معنیٰ قتال) ایک مشروط حکم ہے، وہ کوئی مطلق حکم نہیں۔ یعنی جہاد (بہ معنیٰ قتال) دفاعی طور پر صرف اُس وقت کیا جائے گا جب کہ خارج سے باقاعدہ مسلح جارحیت کی گئی ہو۔ یہ دفاعی جہاد بھی منظّم ریاست کا فریضہ ہے نہ کہ افراد یا غیر حکومتی ادارے کا۔

مزید یہ کہ جہاد (بہ معنی قتال) کا تعلق حالات سے ہے۔ یعنی جس وقت جہاد کا فعل کرنا ہو، اُس وقت کے حقیقی حالات کی نسبت سے دیکھا جائے گا کہ فریقِ ثانی کے مقابلے میں نتیجہ خیز جدوجہد کا طریقہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں قتال عملاً ایک ناممکن چیز بن چکی ہے۔ قتال اب کسی کے لیے بھی کوئی درست انتخاب نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ زمانہ ایٹم بم کا زمانہ ہے۔ پہلے زمانے میں تلوار سے جنگ ہوتی تھی۔ تلوار کے ذریعے جنگ کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں جدید ہتھیاروں کی تیاری نے جنگ کو عمومی تباہی (mass destruction) کا زمانہ بنا دیا ہے۔ اِن ہتھیاروں کی فہرست میں ایٹم بم نمبر ایک کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں تقریباً تمام بڑے ملک یا تو ایٹم بم بنا چکے ہیں، یا

انھوں نے ایٹم بم بنانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تازہ سروے کی رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (17/اکتوبر 2006) میں چھپی ہے۔ اس کی سُرخی کے الفاظ یہ ہیں:

40 more countries have skill to build the bomb.

اکتوبر 2006 میں نارتھ کوریا نے ایٹم بم کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ امریکا کی، نیوکلیر پرولفریشن (nuclear proliferation) کو روکنے کی پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے۔ چنانچہ معلوم طور پر کم از کم چالیس ملکوں تک نیوکلیر ہتھیاروں کا پھیلاؤ پہنچ چکا ہے۔

ایسی حالت میں جہاد کے نام پر جنگ کی بات کرنا، صرف تباہی کی بات کرنا ہے۔ اسلامی جہاد ایک مثبت فائدے کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن جب جنگ عملاً صرف دوطرفہ تباہی کے ہم معنیٰ بن چکی ہو تو جہاد (بہ معنی قتال) کا حکم بلاشبہہ بدل جائے گا، جیسا کہ اسلامی شریعت کا مسلّمہ ہے: **تتغيّر الأحكام بتغيّر الزّمان والمكان۔**

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے میں جنگ ایک غیر عملی چیز بن چکی ہے۔ اب جنگ کسی کے لیے بھی کوئی قابلِ انتخاب چیز نہیں۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ابدی مذہب ہے۔ اگر جہاد (بہ معنیٰ جنگ) کو اسلام کا ابدی حصہ مانا جائے تو ایسا ماننا، خود اسلام کی ابدیت کو مشتبہ کردے گا۔ میں نے واشنگٹن (امریکا) کے ایک سیمنار (فروری 1998) میں اِس موضوع پر بولتے ہوئے کہا تھا:

Islam claims to be an eternal religion, and an eternal religion cannot afford, in its scheme, a principle which was not sustainable in the later periods of human history.

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں کہ جہاد (بہ معنی قتال) شریعت کا ایک ابدی حکم ہے، جو مسلمان قتال نہ کرے وہ کافر ہوجائے گا۔ ایسا کہنے والے لوگ، دوسرے الفاظ میں، یہ کہہ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے میں کسی مسلمان کے لیے اب صرف دو میں سے ایک کا انتخاب رہ گیا ہے — یا تو وہ جہاد (بمعنیٰ قتال) کرکے اپنے آپ کو ہلاک کرلے، یا وہ جہاد کو چھوڑ کر کافر بن جائے۔

وہ گمراہی جس کو قرآن میں تفرّق کہا گیا ہے، وہ ہمیشہ اِس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ایک ذہین انسان ایک نص کو پڑھتا ہے، اس کو پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک نکتہ یا شوشہ آجاتا ہے، وہ اس نکتے کو ایک بڑی چیز سمجھ کر اُسی میں جینے لگتا ہے، وہ اس کے حق میں دلیلیں جمع کرتا ہے، اس کو لوگوں سے بیان کرتا ہے، اِس طرح کچھ لوگ اس سے متأثر ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ پھر کچھ لوگ اُس سے متأثر ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ وقت گذرنے کے بعد اس حلقے میں تعصّب کا عنصر شامل ہوجاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو یہ گروہ ایک متعصّب فرقے کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ یہاں آکر اس کی گمراہی اپنے آخری درجے تک پہنچ جاتی ہے۔

اِس فتنے سے بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی ذہن میں جب اِس قسم کا کوئی نکتہ آئے تو وہ ہمیشہ ایسا کرے کہ اس کو اپنی ذاتی پسند کی بنا پر اختیار نہ کرلے، بلکہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے خیال کو شرعی معیار پر جانچے۔ اِس شرعی معیار کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ما أنا علیه وأصحابی** (الترمذی) اِس شرعی معیار کو دوسرے لفظوں میں قرآن اور سنت بھی کہا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ اپنے ذاتی نکتے کو انتہائی بے آمیز انداز میں قرآن اور سنت کے نصوص پر پرکھے، وہ کھُلے ذہن کے ساتھ اس پر ڈسکشن کرے، وہ اس کے لیے دعائیں کرے، وہ اس کے لیے استخارہ کرے۔ اِس طرح کے لمبے تحقیقی مرحلے کے بعد جب اس کا ذہن مطمئن ہوجائے تو اُس وقت وہ اس کو لوگوں کے سامنے ایک نقطۂ نظر کے طور پر بیان کرے۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ رجوع کے لیے تیار رہے، یعنی جب اس کے نقطۂ نظر کے خلاف کوئی شرعی دلیل پیش کی جائے تو وہ توبہ کرے، یعنی اپنے نقطۂ نظر کو چھوڑ دے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ غیر متعلق الفاظ بول کر یہ ظاہر کرے کہ وہ حق پر ہے، اس نے حق سے انحراف نہیں کیا۔ یہاں میں اپنے ذاتی تجربے کے مطابق، اِس معاملے کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

1- موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ تقریباً اتفاق کے ساتھ

یہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو سنگین مسائل پیش آرہے ہیں، وہ دوسروں کی عداوت کی بنا پر پیش آرہے ہیں۔ یہ لوگ متفقہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہودیوں کی سازش، امریکیوں کی دشمنی اور ہندوؤں کا تعصّب اِن مسائل کا اصل سبب ہے۔

راقم الحروف نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں مسلسل طور پر یہ بتایا کہ یہ نظریہ سرتاسر ایک غیر قرآنی نظریہ ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو مصیبت بھی پیش آتی ہے وہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے (وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم، الشوری: 30) اس موضوع پر میں نے قرآن اور حدیث کے دلائل کے ذریعے قطعی طور پر ثابت کیا کہ مسلم رہنماؤں کی سوچ غلط سوچ ہے، لیکن ان رہنماؤں نے رجوع اور اعتراف کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ انھوں نے خود میرے خلاف الزام تراشی شروع کردی۔

2- اسی طرح مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ دعویٰ کیا کہ أقيموا الدين (الشوری: 13) کی آیت مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کرتی ہے کہ وہ مکمل اسلامی نظام کو نافذ کریں اور اس مقصد کے لیے اقتدار پر قبضہ کریں۔ میں نے قرآن اور حدیث کے دلائل کے ذریعے ثابت کیا کہ یہ نقطۂ نظر بے بنیاد ہے، اس کے حق میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ یہاں بھی اِن حضرات نے رجوع اور اعتراف کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ بے بنیاد طور پر میرے خلاف الزام تراشی کرنے لگے۔

3- اِسی طرح ایک گروہ ہے جو ''مسجد والے'' اعمال کو زندہ کرنے کی تحریک چلا رہا ہے، لیکن وہ اپنی اس تحریک کو دعوت کا نام دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم دعوت کا کام کررہے ہیں۔ میں نے قرآن کے واضح نصوص کے ذریعے ثابت کیا کہ دعوت اُس عمل کا نام ہے جو غیر مسلموں کے درمیان اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا جائے۔ مسجد والے اعمال کو زندہ کرنے کی تحریک ایک اصلاحی کام ہے نہ کہ دعوتی کام۔ یہاں بھی ان حضرات نے رجوع اور اعتراف کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ غیر متعلق باتیں بول کر بے بنیاد طور وہ پر یہ ظاہر کرنے لگے کہ ان کا کام عین وہی کام ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔

یہی وہ مزاج ہے جس کو قرآن میں تفرق کہا گیا ہے اور جس سے فرقے وجود میں آتے

ہیں۔ اِس گمراہی سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے آپ کو اجتہاد سے بچائے، یا وہ اس کی قیمت اِس طرح ادا کرے کہ وہ ہمیشہ رجوع اور اعتراف کے لیے تیار رہے۔

یہ غلطی کوئی سادہ غلطی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سنگین غلطی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ محض ایک لفظی فرق کا معاملہ ہے، غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیے کہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ، غلطی کو جرم بنا دیتا ہے۔ غلطی قابلِ معافی ہے لیکن جرم قابل معافی نہیں، الّا یہ کہ آدمی توبہ کرے اور کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے حق کی طرف دوبارہ واپس چلا جائے۔

اوپر ہم نے اس قسم کی تین مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال کو لیجئے۔ اِس مثال کا ایک عظیم نقصان یہ ہوا کہ مسلمان کے اندر غیر مسلم قوموں کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ اِس نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے لیے یہ قومیں مدعو نہ رہیں، بلکہ عملاً وہ ان کے لیے حریف اور رقیب بن گئیں۔ اور جب ایسا ہو کہ مدعو قوم داعی کو دشمن اور حریف دکھائی دینے لگے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ داعی کے دل میں اس قوم کے لیے دعوت کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ یہی وہ واحد سبب ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر کمیونٹی ورک تو بہت بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے، لیکن دعوہ ورک کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ حالاں کہ دعوہ ورک مسلمانوں کی ایک ایسی لازمی ذمے داری ہے جو کسی بھی حال میں ان سے ساقط نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوہ ورک کے بغیر مسلمانوں کا امتِ محمدی ہونا ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔

اِسی طرح دوسری مثال کو لیجیے، قرآن میں اقیموا الدین (الشوریٰ) کی آیت اِس معنی میں آئی ہے کہ ذاتی اختیار کے دائرے میں جو دینی فرائض ہیں، اُن کو ہر ہر فرد پوری طرح اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کرے، لیکن جب اس آیت کا مطلب یہ بتایا گیا کہ اسلامی حکومت قائم کرو اور شرعی قوانین کا نفاذ کرو تو لوگوں کے ذہن میں عمل کا نشانہ بدل گیا۔ اُن کی نظر میں ذاتی طور پر مومن اور متّقی بننے سے زیادہ اہم بات یہ قرار پائی کہ وہ سیاسی جھنڈا اٹھائیں اور انقلاب کا نعرہ لگائیں۔ اِس طرح ''مکمل دین'' کی اقامت کے نام پر ''جُزئی دین'' کی اقامت بھی حذف ہو کر رہ گئی۔

یہی معاملہ مذکورہ تیسری مثال کا ہے۔ اِن حضرات کا کام مثلاً اصلاح المسلمین کی نوعیت کا کام ہے، مگر وہ اس کو دعوت الی اللہ کا کام بتاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اِس تحریک میں نہ تو مسلمانوں کی اصلاح کے حقیقی تقاضے پورے ہوتے ہیں، اور نہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام انجام پاتا ہے۔

اس تحریک کے اصولوں کا مطالعہ کیجئے تو آپ پائیں گے کہ اُن کے اصولوں میں ''اکرامِ مسلم'' تو ہے، مگر اکرامِ انسان موجود نہیں۔ ان کے یہاں ''امت کا درد'' تو ہے، مگر انسانیت کا درد نہیں۔ اِس تصور نے اِس تحریک کو ایک محدود فرقہ بنا کر رکھ دیا۔

اِس ذہن کا مزید نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت کا کام کرنے کا ذہن بالکل ختم ہو گیا۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ایسے کام کو دعوتی کام سمجھنے لگے جو دعوتی کام نہ تھا۔ اِس مزاج نے ان کے اندر یہ فرضی یقین پیدا کر دیا کہ وہ دعوت الی اللہ کا کام کر رہے ہیں، حالاں کہ وہ سرے سے دعوت الی اللہ کا کام ہی نہ تھا۔ اِس طرح دعوت کے نام پر اٹھنے والی یہ تحریک عملاً دعوت کی قاتل بن گئی۔ جب انھیں اِس غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی تو انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے ذہن کو درست کر لیں اور صحیح ذہن کے ساتھ اپنا کام کرنے لگیں۔

خصوصی رعایت!

طلبا اور اساتذہ کے لیے ماہ نامہ 'الرسالہ' کا سالانہ زرِ تعاون صرف 50 روپیے کر دیا گیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا بھی اِس خصوصی اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

موت کا مثبت تصور

وسیع خلا میں ان گنت ستارے اور سیارے مسلسل گھوم رہے ہیں، لیکن ان کی رفتار اتنی کامل صحت کے ساتھ قائم ہے کہ ہزاروں سال گذرنے کے باوجود کبھی ان میں ادنیٰ فرق بھی نہیں ہوتا۔ ہر روز کے اخبار میں منٹ اور سکنڈ کے تعین کے ساتھ یہ چھپتا ہے کہ آج کی صبح سورج کے طلوع کا وقت کیا ہے اور شام کو اس کے غروب کا ٹھیک وقت کیا۔ یہی حال تمام ستاروں اور سیاروں کا ہے۔ گویا کہ کائنات میں تنظیم اوقات (time management) معیاری صحت کی آخری حد پر ہے۔ جب کہ انسانی زندگی میں ایسا نہیں۔

اِسی طرح مادّی کائنات پوری کی پوری ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ کائنات کا اصل مادّی سورس ایٹم ہے۔ ایٹم کو بے شمار صورتوں میں ترتیب دے کر کائنات کی تمام چیزیں بنی ہیں، اور جیسا کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز آخری حد تک مکمل ہے۔ مثلاً گھاس اپنے فائنل ماڈل پر ہے۔ شمسی نظام اپنے فائنل ماڈل پر ہے، اسی طرح تمام چیزیں۔ گویا کہ کائنات سورس مینج منٹ (source management) کا آخری کامل نمونہ ہے۔ جب کہ انسان کو اپنی زندگی میں یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

اِسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کے اندر بے شمار سرگرمیاں ہر لمحہ جاری رہتی ہیں، لیکن یہ تمام سرگرمیاں پوری طرح نتیجہ خیز (result-oriented) صورت میں ہوتی ہیں۔ وسیع دنیا میں کوئی بھی سرگرمی بے نتیجہ نہیں۔ حتی کہ کیڑے مکوڑے جو رات دن سرگرمِ عمل رہتے ہیں، وہ بھی انتہائی مفید کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔ جب کہ انسان کی زندگی میں اِس قسم کی کامل درجے میں مفید سرگرمیاں موجود نہیں۔

اِسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں کی کوئی بھی چیز جمود کی حالت میں نہیں۔ ہر چیز مسلسل طور پر متحرک ہے۔ ایٹم کے اندر برقی ذرات کی غیر مَرئی گردش سے لے کر وسیع خلا میں ستاروں کی مسلسل گردش تک ہر چیز حالتِ حرکت میں ہے۔ اس کے باوجود کائنات کے کسی بھی حصے میں ٹکراؤ کا حادثہ پیش نہیں آتا۔ گویا کہ ہماری دنیا میں عالمی سطح پر بے مسئلہ کلچر (no problem culture) قائم

ہے۔ جب کہ انسان کو اِس قسم کی زندگی حاصل نہیں۔

اِسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں کی تمام چیزیں نفع بخشی کے اصول پر اپنا کام کرتی ہیں۔ سورج سے نکلنے والی شعاعوں سے لے کر درختوں سے نکلنے والی آکسیجن تک تمام چیزیں دوسروں کے لیے یک طرفہ طور پر نفع بخش بنی ہوئی ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ گویا کہ موجودہ دنیا میں ہر طرف لینے کے بجائے دینے کا کلچر (giver culture) رائج ہے، مگر انسان کی دنیا میں اِس قسم کا کلچر موجود نہیں۔

ایک فلسفی کا قول ہے کہ — موجودہ دنیا میں ہر چیز حسین ہے، یہ صرف انسان ہے جو کہ حسین نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ ہر عورت اور مرد کو ہوتا ہے۔ سورج جب صبح کو طلوع ہوتا ہے اور شام کو جب وہ غروب ہوتا ہے تو وہ کسی آنکھ والے کے لیے ایک انتہائی حسین مشاہدہ ہوتا ہے۔ سرسبز درخت کو دیکھ کر آنکھ کو بے پناہ تازگی ملتی ہے۔ بہتے ہوئے دریا کے کنارے آپ کھڑے ہوں تو وہاں آپ کو ایک اتھاہ سُرور کا تجربہ ہوتا ہے۔ پھول اور پھل، دریا اور پہاڑ حتیٰ کہ گھاس تک میں بھی آدمی کے لیے حسنِ مشاہدہ کی ایک کائنات نظر آتی ہے۔ مگر انسان کو خود اپنی زندگی میں یہی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔

انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے معیار پسند (idealist) واقع ہوا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ حد تک یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی معیاری دنیا پائے اور اس کے اندر ہمیشگی کی زندگی بسر کرے، مگر آدمی اپنی اِس مطلوب دنیا کو نہیں پاتا اور محدود عمر گذار کر ایک ایسی دنیا میں مرجاتا ہے جہاں کی ہر چیز اُس کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ یہاں معیاری دنیا کو پانا پوری طرح ممکن ہے۔

فلسفیوں کے نزدیک موت کے دو تصور ہیں۔ ایک ہے منفی تصورِ موت (negative concept of death) اور دوسرا ہے مثبت تصورِ موت (positive concept of death)۔ سائنس کا اصول ہے کہ جو تصور حقائق سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو، اس کو بطور واقعہ قبول کرلیا جائے گا اور جو تصور حقائق سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ تصور غیر واقعی سمجھ کر رد کر دیا جائے گا اِس پہلو سے دیکھئے تو منفی تصورِ موت قابلِ رد قرار پاتا ہے اور مثبت تصورِ موت قابلِ قبول ٹھیرتا ہے۔

کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز اپنے امکان (potential) کو واقعہ (actual) بنا رہی ہے۔ مثلاً درخت کا بیج اپنے امکان کو آخری حد تک واقعہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایٹم اپنے امکان کو آخری کامل حد تک واقعہ بنائے ہوئے ہے، وغیرہ۔ یہ صرف انسان ہے جو اتھاہ امکان لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے امکانات کو تکمیل تک پہنچائے بغیر مر کر دفن ہو جاتا ہے۔ انسان کے مائنڈ میں سو ملین، بلین، بلین پارٹکل ہیں۔ انسان کا مائنڈ اتھاہ امکانات کا خزانہ ہے، لیکن انسان اِس امکان کو بمشکل چند فیصد استعمال کرتا ہے اور پھر موت اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

موت کا مثبت تصور ہی موت کا حقیقی تصور ہے۔ کیوں کہ تمام متعلق حقائق (relevant data) اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ موت کے مثبت تصور کا مطلب یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ موت ابدی زندگی میں داخلے کا دروازہ ہے۔ موت کے بعد آدمی اُس طویل تر مرحلۂ حیات میں داخل ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پا سکے۔ جہاں اس کو یہ موقع ہو کہ وہ اپنی ہستی کے اتھاہ امکانات کو بروئے کار لا سکے۔

موت کے مثبت تصور کا پیغام یہ ہے کہ موت سے پہلے کے مختصر مرحلۂ حیات میں اپنے اندر اُس ربّانی شخصیت کی تعمیر کرو جو موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں تم کو تمھاری آرزوؤں کے مطابق، ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی دنیا میں جینے کا مستحق بنائے۔

سہارن پور (یو پی) میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں۔ یہاں سے دعوتی مقصد کے لیے کتابیں مفت بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ پتہ درج ذیل ہے:

Dr. Mohd. Aslam
3/1108, Dehradun Chowk
Saharanpur-247001, U.P.
Mob. 9997153735

محاسبہ یا ڈی کنڈیشننگ

اسلام کی تعلیمات میں سے ایک بنیادی تعلیم وہ ہے جس کو محاسبہ (introspection) کہا جاتا ہے، یعنی اپنے آپ پر نظر ثانی کرنا، اپنے آپ کو خود سے جانچ کر اپنی اصلاح کرنا، اردو زبان میں اِس عمل کو احتساب کہا جاتا ہے۔

محاسبہ کے بارے میں بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا، وزنوا قبل أن توزنوا، وتزيّنوا للعَرض الأكبر** (الترمذی، کتاب القیامۃ) یعنی اپنا حساب کرلو اِس سے پہلے کہ تمھارا حساب کیا جائے، اپنے آپ کو تول لو اِس سے پہلے کہ تم کو تولا جائے، اور بڑی پیشی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلو۔

اِس حقیقت کو قرآن اور حدیث میں دوسرے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أكثروا ذكر هادم اللّذات الموت** (الترمذی، کتاب القیامۃ) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذّتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ موت کا سب سے زیادہ دہشت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ اچانک آدمی کو اکیلا کر دیتی ہے۔ آدمی اچانک ہی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی تمام چیزیں اُس سے چھوٹ جاتی ہیں۔ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو بے سہارا اور بے سروسامان محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس آدمی کو مکمل طور پر ہلا دیتا ہے۔ جو آدمی موت کی اِس سنگین حقیقت کو سوچے، اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ مکمل طور پر مَین کٹ ٹو سائز (man cut to size) ہو جائے گا۔ یعنی ہر قسم کی مصنوعی بڑھوتری سے پاک ہو کر انسانِ اصلی بن جانا۔

محاسبہ کے عمل کو آج کل کی زبان میں ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کہا جاسکتا ہے، یعنی اپنے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانا یہاں تک کہ آدمی کی اصل شخصیت سامنے آجائے۔ ہر آدمی مختلف قسم کے غیر فطری احساسات میں جیتا ہے۔ مثلاً احساسِ برتری، نفرت، انتقام،

جھنجھلاہٹ، اشعال، وغیرہ۔ محاسبہ ان احساسات کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو آدمی برابر اپنا محاسبہ کرے، اس کا حال یہ ہوجائے گا کہ اس کی شخصیت کے اوپر سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جائیں گے اور وہ اُس فطری حالت پر پہنچ جائے گا جیسا کہ خدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔

اِسی حقیقت کو حدیث میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **کلّ مولود یولد علی الفطرة، فأبواہ یھوّدانِہ أو ینصّرانہ أو یمجّسانہ** (البخاری، کتاب الجنائز) اِس قول رسول میں اس حقیقت کو بتایا گیا ہے جس کو آج کل کی زبان میں کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر عورت یا مرد کسی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِس ماحول کی نسبت سے ان کے ذہن کی تشکیل ہونے لگتی ہے۔ یہ عمل صبح وشام مسلسل طور پر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کے جذبات پر ماحول کا اثر اِس طرح غالب آجاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ سوچ نہیں پاتا۔ ہر انسان کو خدا نے حالتِ فطری پر پیدا کیا ہے، لیکن ماحول کی کنڈیشننگ کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ اس کی فطری شخصیت ڈھک جاتی ہے۔ وہ ایک مصنوعی انسان بن کر رہ جاتا ہے۔

انسانی شخصیت کی اِس مصنوعی تشکیل کو ختم کرنا اور اُس کو دوبارہ حالتِ فطری کی طرف لے جانا، ہر انسان کی سب سے پہلی ضرورت ہے، اور اِسی عمل کا نام ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) ہے۔

ڈی کنڈیشننگ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اِس کی ایک مادّی مثال پیاز کی صورت میں دنیا کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ پیاز ابتدائی شکل میں ایک چھوٹے سے مغز کا نام ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس پر پرتیں (layers) چڑھنے لگتی ہیں، یہاں تک کہ پیاز کا داخلی مغز پوری طرح پرتوں سے ڈھک جاتا ہے اور داخلی مغز کو پانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بیرونی پرتوں کو ایک ایک کرکے اس سے جُدا کردیا جائے۔

موجودہ زمانے میں عام طور پر لوگ ٹنشن کی شکایت کرتے ہیں۔ ذہنی تناؤ موجودہ زمانے کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہر قسم کا دُنیوی سامان اکھٹا کرنے کے باوجود وہ ذہنی تناؤ میں جیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً سر درد ہونا، نیند

نہ آنا، ہاضمے کی خرابی، ذیابیطس، اور بلڈ پریشر کا بڑھ جانا، وغیرہ۔ اِس معاملے کو بھی کنڈیشننگ اور ڈی کنڈیشننگ کے اصول کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔

جائزہ بتاتا ہے کہ ایسے تمام لوگ ذہنی عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ساری کوششوں کے باوجود وہ اپنے مطلوب کو نہ پاسکے۔ انھوں نے جن چیزوں کو حاصل کیا، اُن میں سے ہر چیز کا حال یہ تھا کہ اُن میں پھول کے ساتھ کانٹا بھی موجود تھا۔ کانٹا ان کے لیے غیر مطلوب چیز بن گئی۔ اس کے نتیجے میں وہ ذہنی بے اطمینانی کا شکار ہوگیے اور آخر کار ذہنی تناؤ کے مریض بن کر رہ گیے۔ اِس معاملے کا حل ڈی کنڈیشننگ ہے۔ یہاں ڈی کنڈیشننگ کیا ہے۔ ڈی کنڈیشننگ دراصل یہ ہے کہ آدمی خواہش کو حقیقتِ واقعہ سے الگ کرکے دیکھ سکے:

To see his desires by detaching the reality.

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے لیے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتا ہے جہاں وہ اپنی خواہشوں (desires) کو لامحدود طور پر پورا کرسکے، مگر جب وہ دنیا میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ہر قدم پر حد بندیاں (limitations) موجود ہیں۔ مختلف قسم کی رکاوٹیں اِس بات کو ناممکن بنا دیتی ہیں کہ وہ یہاں اپنی خواہشوں کی دنیا تعمیر کرسکے۔ نقصان، اندیشہ، حادثہ، بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کی دوسری ناموافق چیزیں آدمی کے لیے حصولِ مقصد کی راہ میں فیصلہ کُن طور پر رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ بظاہر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ ذہنی تناؤ کا شکار بن جاتا ہے۔

اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی خواہش کو خارجی حقیقتوں سے الگ کردینا۔ جو آدمی ایسا کرے اس کو فوراً ذہنی سکون حاصل ہوجائے گا۔ اب اس کی سوچ یہ بنے گی کہ جو کچھ مجھے ملا، عملاً وہی مل سکتا تھا، اس سے زیادہ کو پانا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ اور جس چیز کو پانا ممکن ہی نہ ہو اس کا غم کرنے کی کیا ضرورت۔

تزکیہ نام ہے تربیتِ شعور کا

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں ارشاد ہوا ہے: زُيّن للنّاس حبُّ الشهوات (آل عمران: 14) یعنی لوگوں کے لیے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی۔ اِسی طرح قرآن کی سورہ نمبر 49 سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر کیے ہوئے اعمال بھی قابلِ مواخذہ ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: أن تحبط أعمالكم وأنتم لا تشعرون (الحجرات: 2) یعنی ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ اِن دونوں آیتوں کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ ایک آیت کو سمجھنے سے دوسری آیت سمجھ میں آتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے ذہن کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کو شعوری ذہن (conciousmind) اور دوسرے کو غیر شعوری ذہن (unconciousmind) کہا جاتا ہے۔ انسان کے تمام اعمال، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب کے سب ذہن کے تحت واقع ہوتے ہیں۔ کچھ اعمال کا تعلق شعوری ذہن سے ہے اور کچھ اعمال کا تعلق غیر شعوری ذہن سے۔ انسانی جسم کا کوئی بھی عمل، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خود جسم کے تحت نہیں ہوتا، بلکہ سب کا سب براہِ راست اس کے ذہن سے کنٹرول ہوتا ہے۔ اِسی کو مذہبی اصطلاح میں نیت کہا جاتا ہے۔

کوئی غلط یا نامناسب کام جب آدمی پہلی بار کرتا ہے تو وہ اس کو اپنے شعور کے تحت کرتا ہے۔ مثلاً مزاحیہ کلام کو لیجیے۔ آپ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اِس دوران آپ کے ذہن میں ایک مزاحیہ بات آ گئی۔ اب آپ کے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سوچیں کہ ہنسی مذاق کی بات کرنا کسی سنجیدہ انسان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ سوچ کر آپ چپ ہو جائیں۔ یہی طریقہ صحیح طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب آپ کے ذہن میں کوئی مزاحیہ بات آئی اور آپ نے فوراً اس کو کہہ دیا۔ لوگ اس کو سُن کر ہنسنے لگے۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ کے شعوری ارادے میں ایک

درجے کی کمزوری آجائے گی۔ اس کے بعد آپ جب بار بار ایسا ہی کریں اور مزاحیہ کلام بول کر لوگوں کو ہنساتے رہیں تو یہ انداز آپ کی عادت (habit) بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ انداز آپ کے شعور سے گذر کر آپ کے لاشعور میں داخل ہو جائے گا۔ یہاں پہنچ کر مزاحیہ کلام کے بارے میں آپ کی حساسیت ختم ہو جائے گی۔ اب ایسا ہوگا کہ آپ ہر بار مزاحیہ کلام بول کر لوگوں کو ہنساتے رہیں گے اور آپ کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ آپ کوئی غیر سنجیدہ کام کر رہے ہیں۔ اِسی بات کو قرآن کی مذکورہ آیت میں تزئین کہا گیا ہے۔

اِس لیے جو شخص اپنا تزکیہ چاہتا ہو، اس کو ایسا کرنا چاہیے کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں اپنے کو چیک کرے۔ پہلی بار جب اس کے ذہن میں کوئی مزاحیہ بات آئے تو وہ اس کو زبان پر آنے سے روکے۔ اِس طرح ایسا ہوگا کہ مزاحیہ بات کرنا اس کی عادت کا حصہ نہیں بنے گا۔ ہر ایسے موقع پر اس کا شعور فوراً متحرک ہو جائے گا اور اس کو یہ کہہ کر روک دے گا کہ ہنسی مذاق کی بات کرنا، ایک غیر سنجیدہ فعل ہے۔ وہ کسی انسان کے لیے کوئی مناسب روش نہیں۔

اِسی ایک مثال سے بقیہ تمام معاملات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انسان کے اندر جتنی بھی غلط یا نامناسب باتیں پائی جاتی ہیں، وہ سب اِسی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آدمی ایک نامناسب روش کو جب بار بار اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے لاشعور میں داخل ہو کر اس کی عادت بن جاتی ہے۔ وہ عادت کے طور پر (habitual way) میں اس کو کرنے لگتا ہے۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ اِس قسم کی روش پر بھی اس کا مواخذہ ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تم کو چاہیے تھا کہ تم پہلے ہی مرحلے میں اپنے شعور کو متحرک کر کے اپنے آپ کو غلط روش سے باز رکھتے۔ تم اپنے آپ کو اِس سے بچاتے کہ یہ چیز تمھارے لاشعور میں داخل ہو کر تمھاری عادت بن جائے۔

امید پر خاتمہ

ہندستان کی فلم انڈسٹری میں رشی کیش مکھر جی (Hrishikesh Mukherjee) ایک معروف نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 27/اگست 2006 کو بمبئی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 84 سال تھی۔ اپنے آخری زمانے میں انھوں نے بمبئی کے ایک مکان میں تنہائی کی زندگی گذاری۔ ان کے ساتھ صرف اُن کا گھریلو ملازم مینو (Meno) رہ گیا تھا۔ انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ 28/اگست 2006 میں ان کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں رپورٹر نے ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:

His last stage was painful. Dialysis, ventilators were his companions for the last three months or more. More than that there were the sorrows of his personal life. His wife, his brothers, even his younger son had passed away. He lived all alone in Mumbai, with only Meno (domestic help) p. 10

مکھر جی کے ایک قریبی دوست مسٹر سین (Mrinal Sen) آخری دنوں میں ملاقات کے لیے اُن کے گھر گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ مکھر جی نے اپنے کمرے اور اپنے باتھ روم کی تمام دیواروں پر آئینے لگا رکھے ہیں۔ یہ منظر ان کو عجیب معلوم ہوا۔ انھوں نے مکھر جی سے اِس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ چلیے ہم باہر بیٹھ کر سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھیں گے۔ چناں چہ ہم لوگ باہر بیٹھ گیے۔ جب سورج غروب ہوا تو مکھر جی نے اپنا طویل سکوت توڑتے ہوئے کہا کہ — ایک دن اور کٹ گیا:

One more day has gone by.

جب میں نے اس رپورٹ میں رشی کیش مکھر جی کا حال پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ اُس انسان کا المیہ ہے جس کو زندگی کی حقیقت معلوم نہ ہوسکی۔ جو اپنی عمر کا ایک ایک دن مایوسی کی حالت میں گذار رہا تھا۔ اس کے برعکس حال اُس انسان کا ہوتا ہے جس نے سچائی کو دریافت کیا ہو۔ جو اِس حقیقت کو جان

چکا ہو کہ موت کے بعد وہ اگلے دورِ حیات میں داخل ہوگا جہاں خدا کی ابدی جنت ہے اور وہاں خدا کی رحمتیں سچے انسان کا انتظار کر رہی ہیں۔ ایسا آدمی زبانِ حال یا زبانِ قال سے کہے گا کہ — جنت ایک اور دن قریب آ گئی:

One more day closer to Paradise.

یہ حقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو ہریرہ کی زندگی سے معلوم ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ (عبدالرحمٰن بن صخر الدّوسی) نے 80 سال کی عمر میں 679 عیسوی میں مدینہ میں وفات پائی۔ روایات میں آیا ہے کہ آخر عمر میں ابو ہریرہ سخت بیمار ہوئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کی بیوی کی زبان سے نکلا: واکرباہ! (ہائے تکلیف) ابو ہریرہ نے سنا تو کہا: واطرباہ! (ہائے خوشی) پھر انھوں نے کہا کہ — کل میں اپنے ساتھیوں سے ملوں گا، محمد سے اور ان کے گروہ سے۔ (غداً نلقی الأحبّة، محمداً و حزبه)

مذکورہ دونوں واقعات کے درمیان یہ فرق بتاتا ہے کہ حقیقت سے بے خبر انسان اور حقیقت سے باخبر انسان کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو نہ جانتا ہو کہ بعد از موت بھی زندگی ہے جس کو اگلے دورِ حیات کی خبر نہ ہو، وہ چند دن کے لیے موجودہ دورِ حیات میں بظاہر خوش نظر آتا ہے لیکن جب وہ بوڑھا ہوتا ہے اور وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ آگے اس کے لیے تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ احساس اس کو مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کا خاتمہ اِس طرح ہوتا ہے کہ اس کے پاس ناامیدی کے سوا کوئی اور سرمایہ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جس کو سچائی کی دریافت ہوگئی ہو۔ جو خدا کی تخلیقی اسکیم (creation plan) کو جان چکا ہو۔ جس کو یہ معلوم ہو کہ قبل از موت دورِ حیات میں اُس کو خدا رُخی زندگی (God-oriented life) گذارنا ہے، تاکہ بعد از موت دورِ حیات میں وہ اس کے انعام کے طور پر خدا کی ابدی جنت میں جگہ پائے۔ ایسے آدمی کے لیے زندگی امّید سے بھرا ہوا ایک تجربہ ہے۔ وہ امید کے ساتھ جیتا ہے اور امید کے ساتھ موت کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے انسان کے لیے

مایوسی کا کوئی سوال نہیں، نہ حال کی زندگی میں اور نہ مستقبل کی زندگی میں۔

موجودہ زمانے میں صنعتی انقلاب نے انسان کو ہر قسم کی آسائش کا سامان دے دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر آدمی تناؤ (tension) اور اسٹریس (stress) میں جیتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ جدید صنعتی انقلاب اس کو قبل از موت زندگی کے لیے تو بہت کچھ دے رہا ہے۔ لیکن یہ انقلاب نہ اس کو موت سے بچاتا ہے، اور نہ اس کو موت کے بعد کی زندگی کے لیے کوئی امید افزا پیغام دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر انسان کو ذہنی تناؤ میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

عورت معاونِ حیات

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں عورت اور مرد کے تعلق کے بارے میں ایک آیت آئی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے: ''تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ، اور اپنے لیے آگے بھیجو، اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ تمھیں ضرور اُس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دو'':

And do good beforehand for yourselves. (2:223)

اِس آیت میں — اپنے لیے آگے بھیجو (قدّموا لأنفسکم) کا لفظ بنیادی لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی مرکزی لفظ سے پوری آیت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ آیت کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ تمھارا اصل نشانہ یہ ہونا چاہیے کہ تم وہ کام کرو جو مستقبل میں تمھارے لیے مفید بننے والا ہو (قدّموا ماینفعکم غداً) یعنی آدمی موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے آپ کو اس طرح تیار کرے کہ وہ آگے آنے والی آخرت کی دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کر سکے۔ یہ کسی انسان کا اصل مقصدِ حیات ہے۔ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اِس مقصدِ حیات کی نسبت سے عورت کے معاملے کو سمجھو۔ عورت کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ایک معاونِ حیات کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ جس طرح کھیت کسی کسان کے لیے اس کے مقصد کی نسبت سے معاون کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس زمانے میں یہ قرآنی آیت اتری، اُس زمانے میں مدینہ میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ عورت کا درجہ انسانی زندگی میں کیا ہے۔ اس معاملے میں لوگ اپنے سابق ذہنی نقشے کی بنا پر صرف دو باتیں جانتے تھے — صنفی تسکین اور بقاءِ نسل۔ قرآن میں بتایا گیا کہ اس قسم کے پہلوؤں سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ عورت تمھارے لیے اپنی زندگی کی تعمیر میں ایک معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ تم اپنے اِس فطری معاون کا بھرپور استعمال کرو اور اس کو اپنی تکمیلِ حیات کا ذریعہ بناؤ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ذہنی ارتقاء (intellectual developement) ہے۔ اِس ذہنی ارتقاء کے عمل میں سب سے زیادہ کارآمد چیز انٹلکچول ایکسچینج (intellectual exchange) ہے۔ جس طرح دو پتھروں کے ٹکرانے سے ایک تیسری چیز نکلتی ہے جس کو چنگاری کہا جاتا ہے، اِسی طرح جب دو انسانی ذہن کھُلے طور پر انٹلکچول ایکسچینج کرتے ہیں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دوران زیرِ بحث موضوع کے نیے نیے پہلو سامنے آتے ہیں اور اِس طرح ذہنی ارتقا کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے۔

انٹلکچول ایکسچینج کا یہ عمل مرد کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور عورت کے ساتھ بھی۔ عورت چوں کہ مرد کے لیے ہر وقت کی ساتھی ہوتی ہے اس لیے دیگر افادی پہلوؤں کے علاوہ انٹلکچول ایکسچینج کے معاملے میں وہ بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسی لیے یہاں خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا۔ کیوں کہ عورت ایک ایسی انٹلکچول پارٹنر ہے جو کسی مرد کے لیے ہر وقت قابلِ حصول رہتی ہے۔

صنفی تعلق اگر مطلقاً مطلوب ہوتا تو حضرت مسیح کو بھی ضرور اس کے مواقع دیے جاتے۔ اسی طرح بقاءِ نسل اگر مطلقاً مطلوب ہو تو حضرت محمد کے یہاں بھی اُسے پایا جانا چاہیے۔ حالاں کہ دونوں مثالوں میں یہ چیز مفقود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے جو چیز مطلقاً مطلوب ہے، وہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنا تزکیہ کرکے اپنے آپ کو جنّتی انسان بنائے۔ اِس عمل تزکیہ میں دوسری چیزوں کے ساتھ انٹلکچول ایکسچینج لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو مذکورہ آیت میں عملِ زراعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انٹلکچول ایکسچینج کا ذریعہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورت بھی، مگر تعمیرِ شخصیت کے لیے یہ انتہائی ضروری عمل ایک قربانی چاہتا ہے اور وہ قربانی یک طرفہ صبر ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ انٹلکچول ایکسچینج کے عمل میں مشغول ہوتا ہے تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ بار بار اختلافی پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ اختلافی پہلو نارمل تبادلۂ خیال میں رخنہ ڈالنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کی رائے دوسرے کی رائے سے ٹکرانے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مرد کے ساتھ

ایگوکلیش (ego clash) اورعورت کے ساتھ ایموشنل کلیش (emotional clash) کی نوبت آجاتی ہے۔ایسے موقع پر اگرٹکراؤ کو باقی رکھا جائے تو گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔

ایسی حالت میں گفتگو کو معتدل انداز میں باقی رکھنے کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ کہ گفتگو کا ایک فریق یک طرفہ طور پر صابرانہ روش اختیار کرکے ڈیڈلاک کو ختم کردے اور بدستور معتدل انداز میں تبادلۂ خیال کو جاری رکھے۔

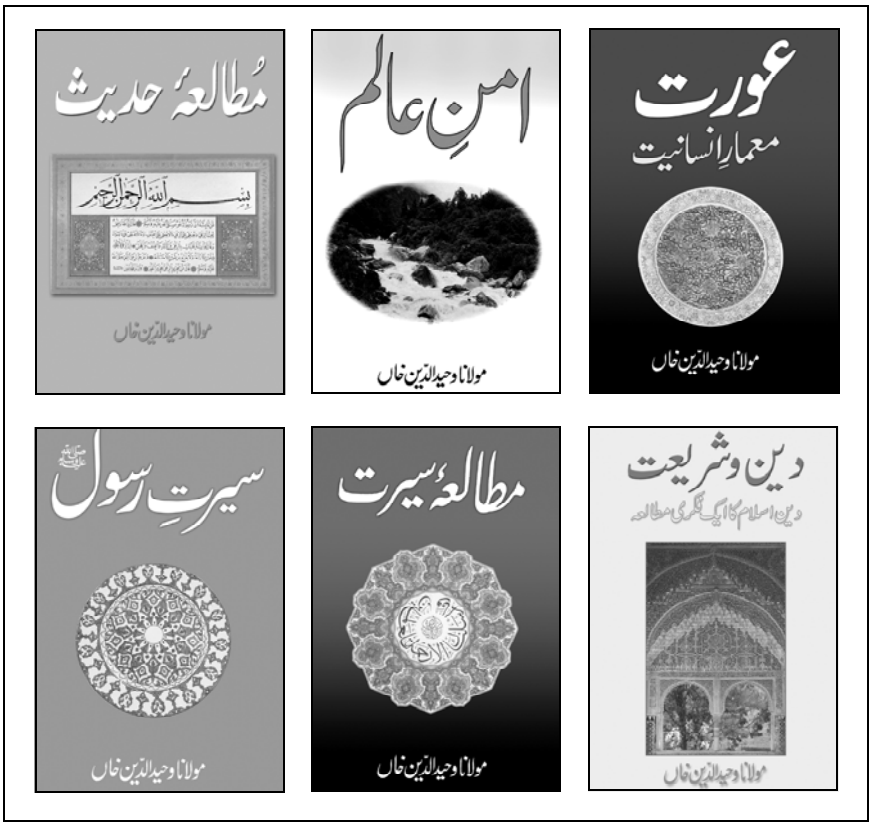

الرسالہ مشن کے متعلق بعض سوالات

1 - ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ اسلام کے نظریاتی پہلو کو بیان کرتے ہیں۔ اسلام کا جو عملی پہلو ہے اس کو آپ بیان نہیں کرتے۔ آخر یہ تفریق کیوں۔

میں نے کہا کہ عمومی اعتبار سے یہ بات درست نہیں۔ میں نے اسلام کے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے۔ مثلاً نماز اور روزہ اور حج جیسے موضوعات پر میری کئی کتابیں موجود ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ میں اسلام کے نظری پہلوؤں پر زیادہ زور دیتا ہوں۔ نظری پہلو سے میری مراد ہے اسلام کی داخلی اسپرٹ، یعنی اسلامی طرزِ فکر پیدا کرنا، لوگوں کے اندر اسلامی جذبہ ابھارنا، اسلام کی صحیح اسپرٹ کو زندہ کرنا۔ یہ میری توجہ کا خصوصی مرکز رہا ہے۔ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ آپ کو یہ بات قابلِ اعتراض اس لیے دکھائی دیتی ہے کہ آپ ہمارے مشن کو امت کی سرگرمیوں سے الگ کرکے دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے مشن کو امت کی عمومی سرگرمی میں شامل کرکے دیکھیں تو آپ کا اعتراض اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ملت مسلمہ کے احیاء کی تحریک عالمی سطح پر چل رہی ہے۔ اس میں امت کے تمام دردمند افراد شریک ہیں۔ میں نے اپنے مطالعے میں پایا کہ احیاء ملت کی یہ تحریکیں بنّانوے فیصد کی حد تک اُسی پہلو پر چل رہی ہیں جس کو آپ اسلام کا عملی پہلو کہہ رہے ہیں۔ آپ دیکھیے تو ان میں سے کوئی نماز اور روزہ اور حج جیسے اسلامی اعمال کا نظام قائم کرنے میں مصروف ہے۔ کسی نے اسلام کے سماجی پہلوؤں پر اپنی توجہ لگا رکھی ہے۔ کوئی اسلام کے سیاسی ڈھانچے کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی مسجد اور مدرسے کے نظام کو قائم کرنے میں مصروف ہے۔ کوئی مسلمانوں کے خاندانی نظام کو اسلامی احکام پر تشکیل دینا چاہتا ہے۔ کوئی ملّی مسائل، یا کمیونٹی ورک کے میدان میں محنت کر رہا ہے، وغیرہ۔ لیکن میں نے اپنے تجربے میں پایا کہ عصری اسلوب میں اسلام کی اسپرٹ کو جگانے کا کام کوئی

نہیں کررہا ہے۔اس لیے ہم نے اپنے آپ کو اس چھوٹے ہوئے کام میں لگا دیا ہے۔گویا کہ ہمارا مشن احیاءِ ملت کے مجموعی کام میں ایک تتمّہ (supplement) کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ حالات میں یہی چیز ممکن اور قابل عمل ہے۔احیاءِ ملت کا موجودہ کام جو عالمی سطح پر انجام پارہا ہے اس کی حیثیت ایک پراسس (process) کی ہے۔اِس پراسس میں ساری تحریکیں اور سارے اجزائے ملّی شریک ہیں۔ہمارا مشن بھی اِس پراسس کا ایک حصہ ہے۔یہ پراسس گویا کہ ایک بلا اعلان تقسیم کار کا معاملہ ہے۔اِس پراسس کے مختلف اجزا میں سے کوئی ایک بھی ساری ملی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا اور نہ کررہا ہے۔ہر ایک کسی ایک پہلو سے ملت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ہر ایک کو اپنی نیت اور اپنے اخلاص کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام ملے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملت کے اندر تنقید نہیں ہونی چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ دوسری ضرورتوں کی طرح، تنقید بھی ملت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔تنقید حدیث کے الفاظ میں: المؤمن مرآۃ المؤمن (ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے) کے اصول کی تکمیل ہے۔علمی تنقید ہمیشہ ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہوتی ہے۔اگر علمی تنقید کا طریقہ ختم کردیا جائے تو اس کے نتیجے میں صرف یہی نہیں ہوگا کہ علمی تنقید باقی نہ رہے گی، بلکہ ذہنی ارتقا کا عمل رک جائے گا۔اس کے نتیجے میں ذہنی جمود پیدا ہوجائے گا جو کسی گروہ کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

2- ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ کا مشن ایک فکری مشن ہے۔آپ کہتے ہیں کہ ہمارا نشانہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کریں۔اِس طرح ہم کچھ لوگوں کے لیے اسلام کو ان کی ڈسکوری بنانا چاہتے ہیں، اور کچھ لوگوں کے لیے اسلام کو ان کی ری ڈسکوری۔آپ کی اِس فکری مہم میں مسلمانوں کا کیا درجہ ہے۔کیا آپ مسلم اور غیر مسلم کو اِس معاملے میں برابر کی حیثیت دیتے ہیں یا آپ کے نزدیک مسلمانوں کو کوئی خصوصی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن اور حدیث کے مطابق، ہماری رائے یہ ہے کہ جہاں تک آخرت کی جزا اور سزا کا معاملہ ہے، اس میں دونوں گروہوں کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔یہ بات قرآن کی اِس آیت سے واضح طور پر

ثابت ہوتی ہے: لیس بأمانیکم ولا أمانيّ أهل الكتاب، من يعمل سوءًا يُجزبه (النساء: 123) یعنی نہ تمھاری آرزوں پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوں پر۔ جو کوئی بھی بُرا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔

یہ عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے کہ مسلمان خود اپنی پیدائش کے اعتبار سے ''منتخب گروہ'' بن چکے ہیں۔ اور ان کی جنّتیں رزرو ہیں۔ یہ عقیدہ سرتاسر بے بنیاد ہے۔ یہ عقیدہ بھی ایک بے بنیاد عقیدہ ہے کہ کچھ ظاہری رسوم ورواج کی تعمیل، یا کسی کلچرل شناخت کو اختیار کرنا آدمی کو جنت کا سرٹفکیٹ دے دیتا ہے۔ جنت نفوسِ مزکّیٰ کے لیے ہے، نہ کہ کسی کلچرل گروہ کے لیے (طٰہٰ: 76)

البتہ ایک اور پہلو ہے جس کے اعتبار سے مسلمانوں کو دوسروں کے مقابلے میں موافق حیثیت (advantageus position) حاصل ہے۔ وہ یہ کہ دوسروں کے برعکس، مسلمانوں کا ذہن اسلام کے خلاف تعصّب سے خالی ہوتا ہے۔ اِس بنا پر مسلمان ممکن طور پر اس قابل رہتے ہیں کہ وہ کسی نفسیاتی رکاوٹ کے بغیر اِس بارے میں غور وفکر کا صحیح نقطۂ آغاز پالیں۔

حدیث میں آیا ہے: كل مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهوّدانه أو ينصرانه أو يمجسانه۔ (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) یعنی ہر پیدا ہونے والا فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یا تو یہودی بنا دیتے ہیں۔ یا نصرانی بنا دیتے ہیں، یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا کسی خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور کسی سماج میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی بچپن ہی سے متاثّر ذہن کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر آدمی بلا استثناء کنڈیشننگ کا ایک کیس ہوتا ہے۔ آدمی کی کنڈیشننگ جس ماحول میں ہوتی ہے، اُسی ماحول کے اعتبار سے اس کی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ کنڈیشننگ کے اِس عمل کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کو اپنے خاندانی مذہب کے ساتھ متعصّبانہ حد تک جذباتی تعلق ہو جاتا ہے، اور دوسرے مذہب کے بارے میں وہ منفی ذہنیت کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ کنڈیشننگ کسی غیر مسلم کے لیے اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں غیر متاثر ذہن کے ساتھ سوچ سکے۔

اِس معاملے میں مسلمان ایک مستثنیٰ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ مسلمان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ مخالفانہ احساس سے خالی ہوکر اسلام کا مطالعہ کر سکے۔ اِس طرح ایک مسلمان کو اسلام کے مطالعے کے لیے ایک موافق نقطۂ آغاز مل جاتا ہے۔ وہ اِس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ معتدل ذہن کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرے اور کسی قسم کی نفسیاتی رُکاوٹ کے بغیر اسلام کی صداقت اس کے ذہن میں بیٹھتی چلی جائے۔

3- ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ — الرسالہ کا انداز غیر معتدل انداز ہے۔ آپ اُس میں ہمیشہ مسلمانوں کو صبر اور تقویٰ کی ''نصیحت'' کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور سازشوں پَر آپ کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ جب کہ دوسرے مسلم اہلِ علم اور رہنما، اعتدال کا طریقہ اپناتے ہوئے ہمیشہ دونوں فریقوں کی غلطی کو بتاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ الرسالہ کا انداز قرآنی انداز ہے، وہ ہرگز غیر معتدل انداز نہیں۔ اِس معاملے کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے غزوۂ احد (3 ہجری) کی مثال دی۔ میں نے کہا کہ مشرکین نے مکہ سے چل کر چار سو کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اور یک طرفہ طور پر مدینہ میں مقیم مسلمانوں پَر جارحانہ اقدام کرکے انھوں نے مسلمانوں کو جنگ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اِس جنگ میں اپنی ایک غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ستّر صحابہ شہید ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، مخالفین کے پتھراؤ کی وجہ سے شدید طور پر زخمی ہوگیے۔

اِس کے باوجود قرآن میں جب اِس آیت پر تبصرہ نازل ہوا تو اُس میں یک طرفہ طور پر ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالتے ہوئے کہا گیا: **حتّٰی إذا فشلتم وتنازعتم فی الأمر وعصیتم من بعد ما أراکم ما تحبون** (آل عمران: 152) یعنی جب تم خود کمزور پڑ گیے اور تم نے کام میں جھگڑا کیا اور تم کہنے پر نہ چلے جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھا دی تھی جو تم چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ آپ کے نزدیک ایسے موقع پر معتدل انداز یہ تھا کہ دونوں فریقوں پر تبصرہ کیا جاتا۔ پہلے مشرکینِ مکہ کے جارحانہ اقدام کی کھلے طور پر مذمت کی جاتی اور اُس کے بعد مسلمانوں کو

نصیحت کرتے ہوئے ان کی کمزوری بتائی جاتی۔ حالاں کہ قرآن کے اِس تبصرے میں ایسا انداز نہیں ہے۔ اِس میں مشرکینِ مکہ کے جارحانہ اقدام کا سرے سے کوئی ذکر موجود نہیں، بلکہ اِس آیت میں ساری ذمے داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ احد کی شکست کسی دشمن کی سازش اور ظلم کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ شکست خود تمھاری اپنی کمزوری کا نتیجہ تھی۔

میں نے کہا کہ اگر آپ قرآن کے اِس تبصرے کو درست سمجھتے ہیں تو آپ کو یقیناً الرسالہ کے انداز ہی کو صحیح انداز سمجھنا چاہیے۔ الرسالہ کا انداز خالص قرآنی انداز ہے، نہ کہ غیر معتدل انداز۔

میں نے کہا قرآن میں واضح طور پر یہ آیت موجود ہے: **إن تصبروا و تتقوا لایضرکم کیدھم شیئًا** (آل عمران: 120) یعنی اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو (مخالفین) کی کوئی بھی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اِس آیت سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے اصل مسئلہ سازش کا ہونا نہیں ہے، بلکہ صبر اور تقویٰ کا نہ ہونا ہے۔ اگر کسی گروہ کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود ہے تو یہ صبر اور تقویٰ ان کے لیے ہر سازش کے خلاف ایک چیک بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر کوئی مسلم گروہ کسی مخالف گروہ کی سازش کا نشانہ بنے تو قرآن کے مطابق، لازماً یہ یقین کرنا چاہیے کہ صبر اور تقویٰ کے نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ سازش کی موجودگی نقصان کا سبب نہیں، بلکہ صبر اور تقویٰ کی عدم موجودگی نقصان کا اصل سبب ہے۔ اس لیے تمام لکھنے اور بولنے والوں کو صبر اور تقویٰ کی اسپرٹ جگانے پر مصروف ہونا چاہیے، نہ یہ کہ وہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف بے فائدہ طور پر احتجاج اور شکایت کی مہم میں لگ جائیں۔ صبر اور تقویٰ کامیابی کی واحد خدائی ضمانت ہے، جب کہ احتجاج اور شکایت کا طریقہ اپنانا، کامیابی کی اِس واحد خدائی ضمانت سے اپنے آپ کو محروم کر لینا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک انتہائی حکیمانہ بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایسے معاملات میں اگر دونوں فریقوں کو نصیحت کی جائے تو نصیحت غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ نصیحت کے لیے ہمیشہ یک طرفہ کلام موثر ہوتا ہے، تاکہ سامع کی ساری توجہ صرف قابلِ اصلاح پہلو پر پڑے، اس کی توجہ اصل مرکز سے ہٹنے نہ پائے۔

مساجد اور مدارس اور اداروں کے لیے مولانا وحید الدین خاں کی دس کتابوں کا ایک منتخب سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ خواہش مند حضرات آرڈر روانہ کرکے ۴۰ فی صد کی خصوصی رعایتی قیمت پر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمے ہوگا۔ نیز یہ آرڈر صرف ڈی۔ڈی یا M. O. کے ذریعے روانہ کیا جائے گا۔ جو حضرات کتابوں کا یہ منتخب سیٹ مساجد اور مدارس اور اداروں کو اپنی طرف سے ہدیہ کرنا چاہتے ہوں، وہ بھی اِس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر آرڈر کے ساتھ ماہ نامہ الرسالہ (اُردو) ایک سال کے لیے مفت جاری کیا جائے گا۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

سیٹ برائے مساجد	سیٹ برائے ادارہ اور مدارس
1 تذکیر القرآن (اُردو)	1 تذکیر القرآن (اُردو)
2 اللہ اکبر	2 اللہ اکبر
3 مطالعۂ قرآن	3 مطالعۂ سیرت
4 قال اللہ وقال الرسول	4 الاسلام
5 مطالعۂ حدیث	5 فکر اسلامی
6 مطالعۂ سیرت	6 دین وشریعت
7 سیرتِ رسول	7 تجدید دین
8 پیغمبر انقلاب	8 مذہب اور جدید چیلنج
9 عظمتِ اسلام	9 انسان کی منزل
10 انسان کی منزل	10 رازِ حیات
رعایتی قیمت صرف: -/570 Rs.	رعایتی قیمت صرف: -/510 Rs.

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 24355454, 24355729, email: info@goodwordbooks.com

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$10/£5
دو سال	Rs. 200	$20/£10
تین سال	Rs. 300	$30/£15
پانچ سال	Rs. 480	$45/£20